گناہ کی مزدوری

مرزا حامد بیگ

گناہ کی مزدوری

[افسانے]

مرزا حامد بیگ

ضابطہ

کتاب — گناہ کی مزدوری [افسانے]

کمپوزنگ — شاہکار

طبع اول — ستمبر ۱۹۹۱ء

تعداد — ایک ہزار

اہتمام — سفینہ، ابلاغ، ۳۳۰، آئی ٹین ٹو، اسلام آباد

طباعت — ایس۔ ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی۔

قیمت — ۱۰۰/- روپے

تقسیم کار: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۲۵ لوئر مال، لاہور، پاکستان
بیکن بکس، گلگشت کالونی، ملتان، پاکستان

شمس الرحمٰن فاروقی،
وارث علوی
اور
فضیل جعفری
کے لیے،

تزئین

سرورق [کولاژ] : مرزا حامد بیگ

خطاطی : خالد یوسفی

پین ورک :

سانڈنی سوار، حکم نامہ، اندھی گلی، آوازیں، ملاقات، پھول بانٹنے والا، پھیری والا، لاکرز میں بند آوازیں، گناہ کی مزدوری، دستک، راجاجی کی سواری۔	عباس شاہ
اینگلوانڈین لڑکی کی کہانی مہابلی	فرہنگ قمر ذوالفقار آذین
جنم جوگ، کارنیوال، انتظار گاہ۔	اعجاز احمد

سکیچ بک ٹائٹل : اعجاز احمد

مندرجات

افسانے

گناہ کی مزدوری

اردو کہانی کے لیے مرزا حامد بیگ نے جس موضوع کو اختیار کیا ہے اسے اختیار کرنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں' اپنے باطن میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ کیا اس باطن میں ہنوز انسان باقی ہے؟ اور اگر انسان ہی ناپید ہے تو ناموں کی کیا ضرورت ہے اور جب انسان گم نام ہو جاتا ہے تو انسانوں کا جنگل ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک جنگل کی طرف مرزا حامد بیگ نے اشارہ کیا ہے۔ مگر کیا صرف جنگل ہی کی خبر دینا کہانی کا کام ہے؟ انسانوں کے اعتبار سے گم ہو جانے کا خطرہ جیسا مرزا حامد بیگ کی کہانی سے مغلوں کو درپیش ہے' ویسا ہی خطرہ ہم سب کو ہے کہ کہیں ہم انسان کے طور پر باقی نہ رہیں اور ان اچھی یادداشتوں سے بے خبر ہو جائیں جو آدمی کو زمان و مکان میں زندہ رہنا سکھاتی ہیں اور زمین پر ایک اچھی دنیا کو پیدا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔

مرزا حامد بیگ نے عمرانی عمل' کو کہانی کے لیے بطور موضوع استعمال کر کے ہمارے لیے سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک تازہ معیار قائم کیا ہے۔

جیلانی کامران

جہاں تک حامد بیگ کے تہہ دار اور پیچیدہ استعاراتی اسلوب کا تعلق ہے' یہ واضح کر دوں کہ ان کے اس اسلوب کا تعلق تجریدی معنویت سے نہ ہو کر تجزیاتی معنویت سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں لفظی ابہام کے بجائے معنیاتی ابہام نظر آتا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں' منتخب اور منفرد لفظیات اور خوب صورت استعاروں کی مدد سے اپنے لیے ایک ایسا تخلیقی اسلوب وضع کیا ہے' جو ان افسانوں کو پڑھنے اور پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے قاری سے بھی کم از کم ثقافتی اور لسانی سطح پر تخلیقی ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان کا نثری اسلوب بنیادی طور پر نہایت ہی پرسکون' نرم اور مدھم ہے۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں شوریدہ اور برانگیختہ جذبات کا اظہار بھی نرم' غیرجذباتی' لیکن موثر انداز میں ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مظاہر فطرت کی طرف حامد بیگ کا رویہ سائنسی یا آرائشی نہ ہو کر حسیاتی اور فن کارانہ رہتا ہے۔ بسا اوقات بیانیہ اور مناظر' متوازی دھاروں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ بیانیہ کرداروں کے حالات اور ان کے خارجی اعمال کا احاطہ کرتا ہے' جبکہ منظر کا تعلق ان کے احساسات' شعور' لاشعور اور ماحول سے ہوتا ہے۔ دونوں مل کر تاثر کی وحدت کی تشکیل اور تکمیل کرتے ہیں۔

قمیل جعفری

افسانے کا مغل شہزادہ

میرے لیے کسی معروف ادیب کی نگارشات پر تبصرہ کرنے کا یہ پہلا اتفاق ہے نیز میری ادب سے شناسائی بھی پیشہ ور ناقدین جیسی نہیں، البتہ تخلیق کی واردات کے بارے میں میرے اپنے احساسات اور خیالات ہیں جو مروجہ ادبی معیارات پر شاید پورے نہ اتریں۔

مرزا حامد بیگ کے نام اور کام سے تو واقف رہا ہوں لیکن ان سے میری شخصی واقفیت اور ملاقات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ میں انھیں ان کے قدرتی پن میں دیکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ فرد یا تخلیق کار کو اس کے قدرتی پن میں دیکھنے کی صلاحیت خود دیکھنے والے کے اندر سے ہی ابھرتی ہے۔

"گناہ کی مزدوری" کے سارے افسانے میں نے ایک رات میں ہی پڑھ ڈالے۔ دوران مطالعہ جہاں میرے ذہن میں ان گنت خیالات اور سوالات پیدا ہوئے ہیں وہیں مجھے ان افسانوں، کی لفظیات کی تہہ میں اتر کر احساسات کی ایک دنیا بھی دکھائی دی، جس کی ساری تفصیلات کو سمیٹنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔

تاریخ سے شغف کے باعث میری ایک عادت سی بن گئی ہے کہ میں اپنے گردا گرد کروٹ لینے والی کسی بھی زندہ شے کو سماج اور معاشرت کی اس ساخت کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو معروض میں موجود ہے۔

ہمارا پاکستانی ادب یوں تو بڑی حد تک اپنے تخلیق کار کی اہلیت کا ہی آئینہ دار ہے اور سوال یہ نہیں کہ ہمارا ادب اپنے عہد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے یا نہیں' میری دلچسپی تو اس بات میں ہے کہ ہمارا ادیب کہاں تک تاریخ اور سماج کی اپنی معروضی حرکت سے ہم آہنگ ہو پایا ہے۔

ادیب ہمارے سماج میں ایک معاشرتی کارندہ ہے جو لفظوں کی تراش خراش کے فن کا شناور ہے۔ ہمارے ادباء کی اکثریت ہمارے سماج کی درمیانی پرت سے تعلق رکھتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری ادیب برادری اب تک ہمارے درمیانے طبقے کے کلچر اور تمدن کی ہی نمائندگی کرتی آئی ہے یعنی ہمارا ادیب دوسرے طبقوں کا مطالعہ ایک خارجی قوت کے طور پر ہی کرتا آیا ہے۔ اس صورت حالات میں دوسرے طبقوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کی لفظیات اور تکنیک ایک خاص قسم کے روکھے پن کا شکار رہی ہے اور یا پھر پراگندہ نما' نعرہ صفت جملے جنم لیتے آئے ہیں۔ یوں ہم اپنے ادیب کو درمیانی کلاس کے اپنے رکھ رکھاؤ اور اس کی نفسیات کے اتار چڑھاؤ کے دائروں کے اندر رکھ کر دیکھتے ہیں اور ہمیں اس کی فنی صلاحیت اور اہلیت کے تکنیکی اور علمی جائزے تک محدود رہنا ہوتا ہے۔ خصوصا" اس صلاحیت کا جائزہ جو اس نے اپنے خارج میں موجود انسانوں کے جم غفیر کے بارے میں برتی ہے۔ یوں میرے نزدیک پاکستانی معاشرہ اپنی قدرتی اٹھان اور تاریخی طور پر اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والی تخلیقی صلاحیت کے حوالے سے شاید بڑے شاعر اور بڑے افسانہ نگار تو پیدا کر چکا ہے مگر اس نے ابھی تک بڑا ادب تخلیق نہیں کیا۔

یوں تو اس کی اور بہت سی وجوہات رہی ہوں گی مگر ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے کی پوری تخلیقی صلاحیت پر ایک غیرفطری اور مصنوعی طور پر جنم لینے والی مڈل کلاس کا تسلط ہے' جو بین الاقوامی دھینگا مشتی کے جبر کی وجہ سے خواہ مخواہ زندہ ہے اور جو اپنی نفسیاتی وارداتوں کے سوا زندگی کے کسی شعبے میں بھی خودکفیل نہیں ہے۔ اس مڈل کلاس کی نفسیاتی

وارداتوں اور احساسات کو لفظوں کا روپ دینا ہی ہمارے ہاں ایک حاوی رویہ رہا ہے۔

خود میرا اور مرزا حامد بیگ کا تعلق بھی اسی مڈل کلاس سے ہے جسے بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ وہ مڈل کلاس جو دو سو سال پہلے وجود میں آنی شروع ہوئی تھی اور جو ابھی تک اس الجھاوے سے نہیں نکل سکی کہ وہ اپنا ناتا اوپر والی کلاس سے جوڑے یا اپنے سے نچلی پرتوں سے ہم آہنگ ہو۔ یہی گو مگو کی کیفیت اس کلاس کے رجحانات اور رویوں کا تعین کرتی ہے اور یہی رویے ہمیں اپنے ادب میں دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے اپنے کردار اور تخلیق کردہ افسانوی کرداروں میں یہی مماثلت نمایاں ہے مثلاً مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا مرغوب لینڈاسکیپ کیمبل پور کا علاقہ ہے جو مدت سے اقتصادی پس ماندگی کا شکار چلا آیا ہے۔ یہ پنجاب اور سرحد کا وہ درمیانی علاقہ ہے جہاں زرعی منصوبہ بندی نہ ہونے کے برابر ہوئی اور زرعی پیداوار کی سرمائے میں منتقلی کا تناسب بہت کم رہا۔ مرزا حامد بیگ نے اسے جب پہلے پہل محسوس کیا تو یہ وہ دور تھا جب بیرونی ممالک میں کیمبل پور کے اجرتی مزدوروں کی تجارت شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایک ایسا دیہی معاشرہ اور ماحول جہاں بہت ہی پیچھے رہ گئی ہوئی ست رو زندگی تھی اور جہاں پر موجود نسل کے پاس اپنے اور اپنے بزرگوں کے ماضی کے قصے اور ٹوٹی پھوٹی مغل حویلیاں ہی بچ رہی تھیں۔ سوچتا ہوا ذہن انہی کھنڈرات میں تخیل کے گھوڑے دوڑا سکتا تھا۔ خوف اور رومانس' تاریخی تسلسل اور آوارہ گردی' جینے کا جتن اور زندگی کو سہنا۔۔۔ غرضیکہ یہ سب کچھ ان آدمی پونی فصل اگاتی ناہموار اور ہموار زمینوں کے بنجر بازوؤں میں ہی پھیلا ہوا تھا۔ ایسے میں ہمارے افسانہ نگار کو آہستہ آہستہ پتا چلتا ہے کہ میکسم گورکی کے ہاں زندگی کا مطلب کیا ہے اور وکٹر ہیوگو کے ناولوں میں کیسی تڑپ ہے۔

کہتے ہیں کہ شیرشاہ سوری اپنے باپ کی چھوٹی سی جاگیر چلانے کا تجربہ نہ کر چکا ہوتا تو ہندوستان کا انتظام و انصرام کبھی نہ کر پاتا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستان کو سنبھالنا اس وقت مشکل نہیں رہتا' جب چھوٹی سی جاگیر چلانی آ جاتی ہے۔ میں نے فی الحال یہ بالکل نہیں کہا کہ

مرزا حامد بیگ کی اپنے علاقے میں آوارہ گردی کا تجربہ اس کے شعور کے وسیع و عریض کینوس پر پھیلے تجربات اور وارداتوں کو سمیٹنے کے لیے کافی ہے' تجربات اس سے زیادہ مختلف بھی نہیں۔

مرزا حامد بیگ کی دیکھی' پرکھی اور برتی ہوئی وارداتوں میں ماحول اور وقت کا ایک گہرا جبر ہے جو خارج سے اس پر مسلط ہوا۔ اسے اپنے ماحول کا سوتیلاپن بری طرح کھٹکتا ہے اور وہ اس مغل شہزادے کی طرح ہے جو اپنے باپ کے عالیشان محل کے باہر بے بس اور بے اختیار گھومتا ہے۔ یہاں تک کہ اب وہ محل کی اندرونی راہداریوں اور غلام گردشوں سے بھی واقف نہیں رہا۔ یہ محل' مغل حویلیوں کے روپ میں شہزادے کے گرداگرد گھومتا ہے لیکن درحقیقت یہ سب علاقہ مجھ کے اس آوارہ گرد تخلیقی ذہن کی تخیلاتی سطح پر اساری ہوئی حویلی ہی ہے جو اس نے اپنے معروضی جبر سے پناہ حاصل کرنے کے لیے بنائی تھی مگر اب وہ ان زندانوں کو اپنے شایان شان خیال نہیں کرتا۔ شاید اب وہ اپنے لیے جتنے بھی جدید طرز کے در و دیوار اٹھائے گا' اس کے اعصاب پر وہ مغل حویلیاں ضرور مسلط رہیں گی کہ وہ حویلیاں اس کی تخیلاتی اور معروضی' دونوں دنیاؤں میں ایک سی شناخت رکھتی ہیں۔ اپنے افسانوں میں تکنیکی چابک دستی برتتے ہوئے انہیں نیا رنگ دینے میں یہ افسانہ نگار ضرور کامیاب ہو سکتا ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی کی ان گنت محرومیوں کو سمیٹے ہوئے وہ آوارہ گرد لڑکا' جو مغل حویلیوں میں شہزادوں کی طرح گھومنا چاہتا تھا' اپنی خواہش سے کبھی دست بردار نہیں ہو گا۔

یوں مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری پر جم کر بات کرنے سے پہلے چند ایک کیفیتوں پر غور کر لینا بہت ضروری ہے مثلاً یہ کہ "گناہ کی مزدوری" میں یکجا کردہ بہت سے افسانوں میں مرزا حامد بیگ ترائی اور نشیب کے مناظر پینٹ کرتے ہیں۔ ترائی' جہاں آکر قدم ٹھہر جاتے ہیں اور سامنے ایک انجانا اور ان دیکھا علاقہ ہے۔ یہاں مرزا حامد بیگ کے کردار لحظہ بھر کو رکتے ہیں۔ سامنے حیرت ہے یا خوف۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شعوری ارتقا کا دھارا رک گیا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کا پھیلاؤ افسانہ نگار کے گرداگرد کھنچے ہوئے دائروں کے پھیلاؤ سے آزاد

نہیں ہے۔

یہ قید بند کی واردات ان دیکھی قوتوں سے تحفظ مہیا کرتی ہے۔ اسی میں بتا ہے اور یہی بادل ناخواستہ وصول کیا گیا انسانی مقدر بھی۔ پھر کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مرزا حامد بیگ نے ارادتاً" اپنے کئی افسانوں میں موسم سرما کا آسیب تراشا ہے' جسے اظہار کی اکہری سطح پر لفظیاتی اور موسیقیاتی چاشنی پیدا کرنے کا محض فنی انداز ہونا چاہیے تھا لیکن درحقیقت ایسا ہے نہیں۔ یہ سرد ٹھٹھرا دینے والی ناپسندیدہ طاقت ہے' جس کے سامنے ذہن لاشعوری طور پر نہتا اور بے بس ہے۔ یہ لاشعوری سطح پر ٹھٹھر کر رہ جانے کا خوف' محض آرائشی طور پر مصنف کی تحریروں میں نہیں اتر آتا اور نہ ہی یہ کوئی بے معنی مداخلت ہے۔ ذرا تصور کو بڑھایئے:

دور زوال کا ایک مغل شہزادہ ہے جسے اپنے گردو پیش کے جملہ لوازمات کی فکر دامن گیر ہے اور جو اپنے سارے سنگی ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جاگیر میں گھومتا پھرتا ہے۔ اسے نہ تو مزید علاقے فتح کرنے کا شوق ہے اور نہ راج سنگھاسن پر دشمن کے حملے کا شعور۔ وہ محلاتی سازشوں سے مکمل طور پر بے پروا ہے۔ یہ وہی ہے جو ان دیکھے اندھیرے میں اترنے سے خوف زدہ ہے۔ لیکن یہ شہزادہ اپنے تشخص کی شناخت کی جاں توڑ جدوجہد کرتا ہوا جب تصورات کی دنیا تیاگ کر موجود دنیا کے گلی کوچوں میں پہنچتا ہے تو کیا اسے یکدم ایک بڑا افسانہ نگار بن جانا چاہیے؟ کیا اسے اپنے افسانوں کی ہیروئن اس لیے معمولی شکل و صورت کی چننی چاہیئے کہ ہر کس و ناکس کی ہیروئن خوبصورت نازنین رہی ہے؟ کیا اس کے افسانے کا ہیرو اس لیے عام سا ہو اور ہر نوع کی خامیوں سے پر ہو کر مروج افسانے کے ہیرو سے اچھوتا اور الگ دکھائی دے؟ کیا اس اٹھا پٹخ سے افسانہ بلند معیار کا حامل کہلائے گا؟ اور کیا تخیلاتی اور تصوراتی محلات کے دریچوں میں بیٹھی آہو چشم حسیناؤں کے تذکرے تج کر کمھاروں کی دق زدہ لڑکی کا ناک نقشہ لکھنے سے حقیقت پسندانہ افسانہ جنم لیتا ہے؟ ان سارے سوالات کا جواب اور اس کی تفصیل یقیناً آپ کا کچھ وقت لے گی۔

مرزا حامد بیگ کا ایک کردار سوچتا ہے:

"پتا نہیں اردگرد کہیں زندگی ہے بھی یا نہیں۔"

ہمارے عہد کا انسان اپنے اندر کی قبر سے نکلتا ہے تو اسے زندگی کے گلی کوچوں کی راہ نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے معاشرے کا انسان بنیادی طور پر اندرون بیں ہے' وہ تاریخی طور پر "اندر کی قبر" سے نکلنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ زندگی جس طور سے باہر کی دنیا میں رواں ہے' اس کی رفتار موت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ کتنی زیادہ' یہ بتانا بڑے حوصلے کی بات ہے۔ مگر اب اس کا تھوڑا بہت ادراک ہر کسی کو ہو چلا ہے۔

○

اب یہ رائے معتبر ہو چلی ہے کہ تنقید کا فن ادب کی اپنی ماہیت سے بہت آگے نکل گیا ہے اور ہماری تنقید پر مغرب کی چھاپ بڑی حد تک نمایاں ہو چکی ہے۔ بین الاقوامی ادب اور تنقید کے ترجمے سے ہماری مڈل کلاس ذہنی مرض کی حد تک متاثر ہے جس کے نتیجہ میں ہماری سوچ کسی قومی دھارے سے زیادہ خارج سے ترتیب پاتی ہے اور ہمارا ادیب بین الاقوامی تحریکات اور نظریات سے ارادی یا غیرارادی طور پر بری طرح متاثر ہے۔ اب اگر ایک لمحے کے لیے ہم اپنے ادب پر سے مغربی ملبوسات اتار پھینکیں تو ہم خود کو نیم برہنگی کے دور میں کھڑے ملیں گے' اور یہ کوئی المیہ بھی نہیں ہے۔ اتنی خودکفالت بھی کافی ہے۔ اس لیے کہ ہماری سیاست اور اقتصادیات کی دنیا اس سے کہیں زیادہ دگرگوں حالت میں ہے۔

سرد جنگ کے ایام میں کیمونسٹ دنیا کے لوگ ادب کو اقتصادیات کے پیٹ سے براہ راست پیدا ہونے والی اولاد تصور کرتے تھے۔ محض چار برس پہلے بات کی جاتی تو ہم حیران ہوتے کہ ہمارا ادب ہماری اقتصادیات سے ترقی یافتہ کیوں ہے یا ہمارا ادیب ہمارے سیاست دان سے

بڑا دانشور کیوں ہے۔ یا یہ سوال کہ ہمارے ملک کی دانش اور سچائی ادب کی محفلوں سے پھوٹتی ہے یا سیاستدان کی تقریروں سے۔

ادب کا تعین ہماری تاریخ اور انسان کا اپنا معیار کرتا ہے یا سرمائے کا پھیلاؤ۔ مگر آج دانستہ طور پر یہ سوالات نہیں اٹھائے جا رہے۔ سو بین الاقوامی الٹ پلٹ کے اس عہد میں ہمارا ادب بہت بڑی "دانشورانہ مداخلت" سے بچ گیا ہے لیکن اسے ابھی اپنی حقیقت خودشناسی کے مرحلے میں داخل ہونا ہے۔

برصغیر پاک و ہند دکھوں کو اپنی ہڈیوں میں اتار لینے والی دھرتی ہے۔ اس کے باوجود درد کی چیخیں، حساس دلوں تک بڑی صاف سنائی دیتی ہیں۔ اس دکھ کا اشتراک ہی وہ زبان ہے، جس میں یہ دھرتی بات کرتی ہے۔ اس زبان کے کئی انگ ہیں۔ موسیقی، سنگ تراشی، مصوری، رقص اور شاعری، جبکہ افسانہ سب سے کھلی اور سمجھ میں آنے والی زبان ہے۔

افسانہ اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ایک ذہن کو دوسرے ذہن میں اتارے اور یہی وجہ ہے کہ افسانہ نظریاتی ترسیل کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔ عمومی سطح پر ہمارا افسانہ اپنے عہد کی سیاست اور نظری مفاد کے زیراثر رہا مگر یہی وہ عمل تھا جس نے اسے ہماری زندگی سے جوڑ دیا۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے گہرا علمی رویہ اختیار نہیں کیا لیکن ان کے بیشتر افسانوں میں ان کے اپنے اپنے مخصوص عہد کی حسیات اور احساسات کی موجودگی ثابت ہے۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنی تکنیکی کاوش اور قاری کے شوق مطالعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بات کے لیے معمول سے ہٹ کر انداز بیان اختیار کیے ہیں۔ یہاں ہم بے دھڑک انتظار حسین کی بات کرتے ہیں اور مرزا حامد بیگ تک چلے آتے ہیں۔ ہم ان دونوں افسانہ نگاروں کے تخلیق کردہ افسانوں کو ان کے عہد سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے یا شاید نیا افسانہ اپنے سماج اور عہد سے کٹ کر لکھا ہی نہیں جا سکتا۔

ماضی قریب میں جب سماجی جبر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر نیا افسانہ لکھا گیا تھا تو ہم

یہ فخر کر سکتے تھے کہ اس مرحلے پر ہمارے ہاں راجندر سنگھ بیدی' سعادت حسن منٹو اور غلام عباس کا زور دار قلم موجود تھا۔ دوسری طرف آج ہم سریندر پرکاش' خالدہ حسین اور مرزا حامد بیگ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر بین الاقوامی سطح پر بدلتے ہوئے تاریخ کے دھاروں کے زیراثر ہماری سماجی حرکت نئے مرحلوں میں داخل ہو گئی ہے تو آج کا نیا افسانہ لکھنے کے لیے ہمارے پاس قلم کی صلاحیت موجود ہے۔ ان تینوں افسانہ نگاروں نے بڑی حد تک وہ ادبی معیار متعین کرنے کی صلاحیت مہیا کر دی ہے کہ اب ہم اپنے ادب خصوصاً فکشن کو خودکفیل کہہ سکتے ہیں۔ بے شک تاریخ کے زاویہ نظر سے یہ صلاحیت کبھی کبھار مروجہ ظالمانہ نظام کو مضبوط کرنے میں ممدو معاون ثابت ہوتی رہی ہے مگر اس قسم کی رجعت آمیز صلاحیت کا ذمہ دار صرف ہمارا افسانہ نگار نہیں' یا کم از کم مرزا حامد بیگ نہیں۔

مرزا حامد بیگ کے افسانے خصوصاً "پھیری والا" ' "راجا جی کی سواری" اور "لاکرز میں بند آوازیں" اس شعوری کروٹ کی نشاندہی کرتے ہیں اور ہم اس حقیقت سے آگاہ ہوئے جاتے ہیں کہ ہم سے زیادہ باصلاحیت طاغوت ہمارے فکری نظام پر مسلط ہے۔ یہ طاغوت ہمارے اپنے واہموں کو بھی ہمارے خلاف استعمال کرنے کی مکارانہ صلاحیت رکھتا ہے اور جسے ہم محض سیاسی اور اقتصادی قوت نہیں کہہ سکتے۔ یہ اس سے سوا کوئی طاقت ہے جس کا ادراک ابھی ہماری فکشن میں عام نہیں ہوا' لیکن امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ہمارے شعور کی دنیا میں جن دروازوں سے داخل ہو گا وہ "پھیری والا" اور "لاکرز میں بند آوازیں" جیسے دروازے ہوں گے۔

جارحانہ جذبات کے زیراثر ہم نے اکثر بہت کچھ' جوکہ اپنا تھا دوسری کے کھاتے میں ڈال کر تیاگ دیا۔ یہاں مجھے فیض احمد فیض یا ن۔ م۔ راشد کے نام لینے کی ضرورت نہیں لیکن مرزا حامد بیگ کا دفاع کرنے کا حق ضرور حاصل ہے کہ ان کے پاس اپنی دنیا کو گہرائی سے اپنے اندر جذب کر لینے کے سوا کوئی دوسرا رستہ ہی موجود نہیں ہے۔ اب سچائی ہمارے عہد پر ازخود ظاہر ہونے والی ہے۔ ہم ناقابل انکار روشنی میں دھکیل دیے جانے والے ہیں۔ اس لیے کہ غیروں کی

پناہ گاہیں اب اتنی پختہ ہو گئی ہیں کہ وہ ہم سے قطعاً" خوف زدہ نہیں۔ ادھر ہماری دروں بینی نے ہماری ظالمانہ حد بندی کر رکھی ہے۔ اب خارج سے آگہی کو اپنے وجدان کی سمت پھیر دینے کا رجعت پسندانہ رویہ چاہے صوفیانہ درویشی کا روپ لیے ہوئے ہی کیوں نہ ہو' ہمارے اندر روشنی جذب کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرے گا۔

آگہی' ہمیشہ پہلا مرحلہ ہوتا ہے' اگرچہ یہ ثانوی طرز کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ آگہی' ہماری نفسیاتی ساخت سے آزاد عمل نہیں ہے۔ نفسیاتی اندازمیں ہم جمود کے طویل رستے کے کسی ایک پڑاؤ پر اب بھی موجود ہیں۔ اب یہ ہمارے ادیب کا فرض ہے کہ وہ اپنی علمی اور فنی صلاحیت کو نئی دنیا سے ہم آہنگ کرنے کے لیے استعمال میں لائے۔ یہاں ہم غیرارادی طور پر کسی علوم و فنون کے احیا کی بات نہیں کر رہے کہ یہ بھی روایت پسندی ہی ہے۔ البتہ مرزا حامد بیگ جیسے افسانہ نگاروں کے قلم سے وہ لفظ ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو مستقبل قریب میں ہمیں روشنی کے اس متوقع سیلاب میں اپنی شناخت کے لیے استعمال کرنے ہوں گے۔ بہرطور یہ کسی ہمہ گیر عمل کا ہی حصہ ہو گا جس کے ایک دھارے میں ڈاکٹر قدیر جیسی صلاحیت ہو گی اور دوسری جانب باشعور سیاسی جدوجہد' جسے ابھی جنم لینا ہے۔

لگ بھگ ۱۹۳۲ء میں برصغیر کا معاشرتی جمود ٹوٹنے لگا تھا۔ غیر منقسم غلام ہندوستان کا وہ معاشرتی جمود جس کا ذکر کارل مارکس نے' داس کیپٹل' میں کیا تھا۔ یوں تو اس صدی کی دوسری دہائی ہی سے اس سماجی تحرک کا پتا مل جاتا ہے لیکن اس تبدیلی نے اپنا تشخص ابھارنے میں بیس برس لے لیے۔ یہ وہ دور تھا جب بین الاقوامی سامراج سرمائے کے بحران میں جتلا تھا' دنیا میں جہاں تہاں آزادی کی ان گنت مقامی تحریکیں سر اٹھانے لگی تھیں' ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کافی حد تک منظم اور باشعور ہو چکی تھی مگر ساتھ ہی انگریز کا سیاسی نظام جو اس نے ہندوستان میں تنظیم کیا تھا' اپنی جڑیں کر چکا تھا۔ انگریز کا وضع کردہ تعلیمی نظام ہمارے کلچر کا رنگ اختیار کر چکا تھا' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جدید باشعور معاشرہ ابھر کر سامنے آنے لگا تھا۔ تاریخ کے

ایسے ہی اہم مرحلوں پر لخت لخت انسانی صلاحیتیں بھی ابھرنے اور سامنے آنے لگی تھیں۔ جس دور کی ہم بات کر رہے ہیں وہ میرے خیال میں پاکستان کے بننے کے بعد ہمارے ہاں ۱۹۵۵ء تک قائم رہا۔ لگ بھگ ان پچیس تیس برسوں پر محیط اس دور میں دیسی لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ ٹیگور، اقبال، یگانہ، فراق، جوش، حسرت، راشد، فیض، ساحر، راجا راؤ، پریم چند، آغا حشر، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، سجاد ظہیر، احمد ندیم قاسمی اور ایم ڈی تاثیر کی صورت میں غلام ہندوستان نے بولنا شروع کیا۔ فنون لطیفہ کے میدان میں لیفی رحیمن، عبدالرحمٰن چغتائی، بڑے غلام علی خان، دلیپ کمار اور بیتہ جیت رے نے دنیا بھر سے اپنے آپ کو منوا لیا۔ ہندوستان کی صدیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے اندرونی جذبات کو راہ ملی تھی اور سیاسی فلاسفی کے میدان میں زبردست شعوری ابھار پیدا ہوا تھا۔

۱۹۴۷ء کی جغرافیائی تقسیم سے زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہم آزاد ہندوستان کی بات نہیں کرتے جہاں یہ شعوری سطح کسی نہ کسی طرح آج بھی موجود ہے۔ آزادی کے بعد پاکستان میں حرکت معکوس کا عمل شروع ہوا اور ہم بہت جلد انتشار کا شکار ہوئے۔ ہماری اجتماعی جہت بکھرنے لگی اور معاشرہ انفرادی حوالوں کے گرد مختلف گروہی شکلیں اختیار کرنے لگا۔ صلاحیتیں زندگی کے دھارے سے کٹنے لگیں۔ بازار سیاست اور راہزنی میں فرق مٹ گیا اور ریاستی کارندے اپنی تکنیکی صلاحیتوں کی چابک سے رہوار زندگی کو ہانکنے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب فاسٹر ڈلس فنامنا آسیب بن کر ہمارے در و دیوار پر مسلط ہوا۔ ہم سرد جنگ کی مورچہ بندیوں میں لڑھک گئے اور بیرونی طاقتوں نے مقامی گماشتوں کے ساتھ مل کر ہمیں عدالتی تفتیش کی زنجیریں پہنا دیں۔

یوں دیکھتے ہی دیکھتے ہم اپنی جیتی جاگتی دنیا چھوڑ کر ڈریکولا کے پرہول اور اجاڑ قبرستانوں کی دنیا میں سمٹ گئے۔ کاغان کی پرکیف وادیوں سے نیاگرا فال تک کی یہ جلاوطنی خود اختیاری نہیں تھی یہ کلی طور پر جلاوطنی تھی جس کے نتیجہ میں ساری کی ساری زندگی انحطاط اور مصنوعی پن کا

شکار ہونے لگی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ہمارا ادب ان گنت مصنوعی رجحانات کی لپیٹ میں آ گیا۔ ادبی تحریکات میں نظری انتشار اور بے عملی نے عروج پایا اور غیر ملکی فن پاروں کے ترجموں کو مقامی تخلیقات سے بڑا ادب قرار دیا گیا۔ یوں اردو ادب نے ایک ایسے حرف کی صورت اختیار کر لی جس کا کوئی لباس نہیں تھا' جس کی کوئی زبان نہیں تھی اور جس کا اس دھرتی کے ساتھ تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ سطحی قسم کا یہ عامیانہ پن خود اپنی دھرتی سے فرار کی ایک صورت تھی۔ تخلیقی قحط کے اس دور نے ماضی پرستی کو ابھارا' بعض ادبا نے ہجرت کیا تو روسی ادب کے تراجم میں پناہ لی اور کچھ بلھے شاہ' شاہ حسین اور شاہ لطیف میں گم ہو گئے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جو فرانسیسی فن پاروں کے گرویدہ تھے۔ لیکن اکثریت نے مغرب کی ادبی اصطلاحات کو میکانکی طور پر اپنا لیا اور یوں ہم نے اپنے اردگرد کے احساس سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ یہ تیاگ کی اک صورت تھی۔ اب ہمارا حال اس رعایا جیسا ہو گیا جو قحط سالی کے ایام میں اپنے غلے کے گودام ہڑپ کرنے لگتی ہے۔ ویت نام' فلسطین' لاطینی امریکہ اور کانگو کے انسانوں کا دکھ نوحے کی طرح گنگنایا گیا مگر اس سے حلقہ ماتم نہ بن سکا کہ ماتمی سینے اپنا دکھ پیٹتے ہوئے کسی اور کو کب روتے ہیں۔

۶۸-۱۹۶۷ء تک آتے آتے ہم چیخ اٹھے اور فرسودگی فکر نئی نسل کے احتجاج کی زد میں آ گئی۔ حوالے خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ہمارے ادب میں زندگی کا رومانی پن اپنے ہی گلی کوچوں کے حوالے سے پھر ابھرنے لگا۔ جبر کی مشین اتنی زیادہ باصلاحیت تھی کہ یہ ابال زندگی کا حصہ تو نہ بن سکا لیکن اپنے پیچھے زندگی کی حرکت کا سرور چھوڑ گیا۔ سقوط کے ظالمانہ نفاذ کے دنوں میں لوگ عہد رفتہ ہی کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اپنے شجرے بزرگوں سے ملاتے ہیں اور اپنی شناخت اپنے وجود سے باہر ڈھونڈتے ہیں۔ ایسے ہی دن ہم نے بھی دیکھے لیکن زندہ لفظ وہ ہوتے ہیں جو سلے ہوئے ہونٹوں سے نہیں' سوچتی ہوئی آنکھوں سے ٹپکتے ہیں اور کچھ تخلیقات ایسی بھی ہوتی ہیں جو روایت اور مستقبل کے خوابوں کے درمیان ربط قائم کرتی ہیں۔ ہم نے ایسا ہی ربط مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں محسوس کیا۔

مرزا حامد بیگ کا افسانہ بڑے دھیمے انداز میں سماج پر مسلط اس نظام کی نشان دہی کرتا ہے جو وا قعتہً موجود ہے۔ ہمارے افسانہ نگار کو اس کا ادراک زمبابوے یا نکاراگوا کا دکھ پا کر نہیں ہوا بلکہ اس کے اپنے حوالے ہیں، جن سے یہ تانا بانا بنا گیا۔ مرزا حامد بیگ اس نسل کے افسانہ نگار ہیں جس کی ساری زندگی بحرانوں میں گزری ہے اور جسے بڑی مہارت کے ساتھ ان بحرانوں سے مصنوعی انداز میں باہر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عالمی سچائیوں کی یلغار کو خود سامراج نے اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں ہمارے تخلیق کار اور قاری دونوں کو دوسرے براعظموں کے ساتھ سانجھ کے تاثر میں دھکیل دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اپنے درد کی ٹیسوں کی طرف مراجعت دیکھنے میں آئی اور ہم اپنے گلی محلوں میں لوٹ آئے۔ ہمارے ہاں ۱۹۶۸ء کی جمہوری لہر نہ ابھرتی تو مرزا حامد بیگ جیسے اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے تخلیق کار بھی ہمارے ہاں پیدا نہ ہوتے اور ہم اپنے دھرتی پر لوٹنے کا سفر بھی آغاز نہ کر سکتے۔

"گناہ کی مزدوری" مرزا حامد بیگ کا وہ اچھوتا افسانہ ہے جس میں ایک عہد کی سچائی دوسرے عہد سے گلے ملتی ہے اور اس سچائی کا سفر اپنی دھرتی کی جانب ہے۔ حضرت عیسیٰ کی سولی ایک ہیرو پر ظلم اور ایک مظلوم کی سادہ سی کہانی ہے جو ہمیں اس سولی کی دوسری طرف کی دنیا سے بھی روشناس کراتی ہے اور ہم اس ظلم پر بے ساختہ آنسو بہانے کے عمل سے آگے بڑھ کر ظالم قوتوں کی مکاری، فریب اور اس سے کہیں بڑھ کر ان کی طاقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

شہید مسیح کے سینے میں کھولتی سچائی اپنی جگہ مگر فریسی بزرگوں کا جارحانہ تفتیشی رویہ بھی وہ حقیقت ہے جو خود ہمارے سماج پر سالہا سال مسلط رہا ہے اور جسے مرزا حامد بیگ نے اپنی ہڈیوں پر برداشت کیا۔ کوئی اپنے بیٹے کا لاشہ صحن میں چھوڑ کر دوسروں کے جنازے پڑھنے نہیں جاتا۔ دوسروں کے دکھ کو زیادہ سے زیادہ اپنے ہی دکھ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں ڈاکٹر آیانڈے کی برطرفی اور قتل تک محدود رکھنے کی سازش کی گئی جسے ہم نے اپنے بھولپن میں اپنا لیا۔ اس اجنبیت سے باہر نکلنے کا وہ عمل جو مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں اجاگر ہوتا ہے،

دراصل اپنی شناخت کا عمل ہے۔ خود اپنے آپ تک رسائی سے مراد صوف ازم والی غوطہ زنی نہیں۔ یہ اپنے آپ سے باہر اپنے فطری ماحول میں نکل آنے کا عمل ہے جس کی اس دھرتی کی نفسیات کو صدیوں سے ضرورت ہے اور جس کا آغاز اس صدی کی دوسری دہائی سے شروع ہوا تھا مگر طاغوتی قوتوں کی جارحیت کے سبب اس میں بار بار کٹاؤ پیدا ہوتا رہا۔

میرے خیال میں ہماری دھرتی کے مخصوص تاریخی پس منظر میں بڑا ادیب وہی ہے جو اس کٹاؤ کی جبریت کو برداشت کرتے ہوئے احساس اور سوچ کو لفظوں کی کڑیوں سے نکلنے نہ دے۔ مدہوشی اور خود گرفتگی کی صدیاں بیت جانے کے باوجود ہمارے ذہن کے شعوری خانے ابھی منجمد نہیں ہوئے۔ ہم جو صدیوں تک گھوڑے اور لوہے کے تسلط میں رہے۔ ہم، جنہوں نے نسل در نسل اپنی کمائی مال غنیمت میں دان کی ہے۔ ہم جنہوں نے اپنی انا کے تمام تر خارجی روپے خراج میں دے دیے ہیں۔ ہماری ہڈیوں میں اترا ہوا شب و روز کا دکھ ہی وہ اثاثہ ہے جسے اگر ہمارا سوچتا ہوا دماغ کسی طرح ہماری آنکھوں اور چہرے پر اتار دے تو ہم خارج کی زندگی میں اٹھے ہوئے سر کے ساتھ نئے حوصلے باندھ سکیں گے۔ چاند کی بڑھیا اور کوہ قاف کی کہانیاں تو اس دکھ کو باہر نہیں لا سکتیں۔

انٹروورٹ معاشروں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انہیں دو زندگیاں گزارنی پڑتی ہیں۔ ایک اندرونی اور دوسری بیرونی زندگی، لیکن اگر ان میں بعد پیدا ہو جائے تو ان دونوں زندگیوں کا باہمی ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہ بار بار ہوا ہے کہ ہم نے اپنے خارج کی زندگی کو دوسرے معاشروں کے اتنا قریب دھکیل دیا کہ ہم اپنی اندر والی دنیا سے کٹ گئے اور اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خود دوسرے معاشرے ہمیں تیاگ دیں گے۔ اس طرح ہم ان کے ہم قدم رہنے کی مصنوعی صلاحیت بھی کھو بیٹھیں گے۔

اس سارے کے سارے عمل اور رد عمل کا ادراک ہمارے تخلیق کاروں کو ہونا چاہیے۔ میں یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ انہوں نے مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں یہ شعور ملاحظہ

کیا یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مرزا حامد بیگ کے بیشتر افسانوں میں اس کی سمت نمائی ہوئی ہے اور یہ صلاحیت ہمارے نئے سیاسی ذہن' معاشی نظریہ ساز اور ابھرتے ہوئے سائنسی دماغ میں بھی موجود ہے۔ تو کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم تعمیر کے ایک تاریخی مرحلے میں داخل ہوا چاہتے ہیں؟ اب اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو صرف اتنی کہ یہ سب کچھ عوام کے اجتماعی شعور کے اندر جذب ہو جائے۔

○

آج کا انسان تاریخ کے جس مرحلے پر کھڑا ہے وہ یوں تو سماج کی اپنی داخلی اور خارجی حرکت کا ہی مرحلہ ہے مگر اس نے حیرت انگیز نتائج اور حالات کو جنم دیا ہے۔ بین الاقوامی نوعیت کی اس نئی صورت حالات میں ہم مقامی سطح پر بھی بڑے نامحسوس انداز میں متاثر ہوئے ہیں۔

اب اگر ہم اپنے دور کا تجزیہ سیاسی اور تاریخی اصطلاحات کے حوالے سے کریں تو آج میخائل گورباچوف کا پریسٹرائکا کا پروگرام ہمارے عالمی سماج پر ایک حاوی تاثر مرتسم کرتا دکھائی دیتا ہے۔ نجات اور ابدی راحت کا یہ پروگرام اپنی اشتراکی حکمت عملی میں سٹالن ازم کے خاتمے اور سخت گیر مارکسی ازم سے انحراف کا پروگرام ہے' جس نے روس میں جو بھی صورت حالات پیدا کی ہے اس پر بحث کا یہاں موقع و محل نہیں' مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے دنیا بھر کی قومی اور سامراج دشمن تحریکوں پر گہرے اور فوری اثرات مرتب کیے ہیں بشمول ان تحریکوں کے جن سے ادیب بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر منسلک ہیں۔ اب یہ تحریکیں جس ٹوٹ پھوٹ اور نظریاتی پراگندگی کا شکار دکھائی دیتی ہیں اس کی ابتداء بے عملی اور نظریاتی جمود کے تحت بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو ان تحریکوں کا قیادتی ہراول' علمی اور تخلیقی صلاحیت کے اس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا جو بین الاقوامی سامراجی جبر کے سامنے ہمہ گیر نظری

جواز پیدا کر سکتا۔ پھر اس نے بڑی حد تک خارجی گماشتگی کا کردار بھی ادا کیا۔ یہ گماشتگی اس وقت اور گھناؤنی ہو گئی جب دنیا کے انقلابی ہراول روس نے ایک مقامی مفادات کی حامل سپرپاور کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جب ہمارے ہاں ادب اپنی علاقائی اٹھان اور سماج سے گہری وابستگی کے شعور کے زیراثر ایک ابھرتی ہوئی تحریک بن رہا تھا اور تخلیق کا عمل ایک علمی اور نظریاتی قوت اختیار کر رہا تھا کہ اچانک سرد جنگ کا آسیب ایک عالمی جبر کی صورت ابھر کر سامنے آیا اور سوچ کے آزاد دھارے گروہی گٹھ جوڑ میں جکڑے گئے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب ہمارے دانشوروں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر گمرہی کا راستہ اختیار کیا' وہ آہستہ آہستہ چائے خانوں اور گپ شپ کلبوں تک محدود ہوتے گئے' سیاسی دانشور نام نہاد سٹڈی سرکلوں میں کھو گئے اور یوں زندگی کے دھارے سے کٹاؤ نے تنگ نظر اور مذہبی جنونیوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ لیکن یہ ابھار بھی قول و فعل کے تضاد اور تاریخ کے تقاضوں کو سمجھنے کی عدم صلاحیت کی وجہ سے اپنے تنظیمی پھیلاؤ میں کوئی انقلابی اور بڑی تحریک نہ بن سکا۔

سماجی تحرک اور باشعور دانشور کے بیچ یہ دوری فکری جمود کا باعث بنی اور زندگی کے ہرشعبہ میں بے راہ روی (اخلاقی معنوں میں نہیں) کی یہی وجہ تھی۔ اب ان حالات میں دانشورانہ سطح پر پریسٹرائکا نے جو فکری گمراہی مسلط کی ہے' وہ ایک زندہ دماغ کے راہ راست پر آنے کے لیے بڑا زبردست موقع فراہم کرتی ہے اور جسے مرزا حامد بیگ نے اپنے ہاتھوں سے کھونا گوارا نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ اپنی دھرتی پر لوٹ آنے کا وقت ہے۔

"آبادی کے رخ پر کھلنے والے اس بھاری آہنی دروازے کو کھولنے اور بھیڑنے والا عملہ نہ رہا' خچر پر خالی بورا سنبھالے "سرڑ سرڑ" چابک لہرانے اور ڈھکی چڑھنے والے نہ رہے۔ لوہا کوٹنے اور چاک پر کوزے تراشنے والے مٹی میں مٹی ہوئے۔ اب تو

سرسوں کی جگہ جانے کیا کچھ چل نکلا اور کھڈیوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانوں نے لے لی ہے۔ لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس بچی کھچی آبادی کے آثار میرے کہے کی تصدیق کرتے ہیں اور ہماری بڑی بوڑھیاں اپنی آنکھوں پر دونوں ہتھیلیوں کے سائبان لیے اپنے جگر گوشوں کی راہ تکتی ہیں۔"

(افسانہ : انتظار گاہ)

"مردہ خانوں سے دس دس، بیس بیس سال پرانے پوسٹ مارٹم کیے گئے مردے اپنے دو لخت سروں اور موٹے بخیے سے سلے ہوئے پیٹ کو تھامے ہوئے گرتے پڑتے چلے آتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹوں کے خستہ اوراق کے انبار ابھی کچھ دیر پہلے اجاڑ غیر آباد کنوئیں میں جھونک دیے گئے۔"

(افسانہ : لاکرز میں بند آوازیں)

ہماری نسل کی خوش فہمیاں اب ختم ہو جانی چاہئیں۔ باہر کی عیاش ریاستوں میں ہمارے اجرتی مزدوروں کی شکل میں برآمد اس خوش فہمیوں کے سلسلے کو مزید طول دے گی۔ محنت کے تقدس کے نام نہاد نظریے کی بنیاد پر قومی احساس کی یہ بے حرمتی ہی ہمارے تشخص کی شکست و ریخت کا باعث بن رہی ہے۔ ہم باہر سے دولت سمیٹ کر مغربی نظریات درآمد کر کے مفلوج دماغ کے مریض میں اس کی ایڑیوں کے راستے خون داخل کرنے میں مصروف ہیں۔

روسی قیادت نے بین الاقوامی انقلابی تحریک میں خودکفالت پر زور دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ اپنے وسائل دوسری دنیا کے انقلاب کی بھینٹ نہیں چڑھائیں گے نتیجہ" اب تیسری دنیا کو اپنے وسائل اور مقامی قوت پر ہی بھروسہ کرنا ہو گا۔ دوسری طرف مغربی ممالک خصوصاً" مشرقی یورپ' نئی بین الاقوامی صورت حال میں اپنے سرمائے کا رخ دوسری اطراف میں موڑ رہا ہے اور اس نے اپنے گماشتوں کی امداد میں نمایاں کٹوتیاں کرنی شروع کر دی ہیں۔

ہم رفتہ رفتہ اپنی سرحدوں کے اندر دھکیلے جا رہے ہیں۔ اب ہماری فکری گماشتگی اور

معاشی انحصار کے دن پورے ہو گئے۔

وہ قومی تشخص جو کبھی پاکستانیات کے حوالے سے ایک ادبی رجحان کے طور پر سامنے آیا تھا' اسے پہاڑوں اور دریاؤں کی محدود پہچان سے باہر نکال کر عوام اور گلی محلوں کے حوالے سے ابھارنے کی ضرورت ہے' جبکہ مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں یہ رویہ پہلے سے ہی موجود ہے۔ البتہ نئی صورت حالات میں اس کے مزید پھیلاؤ کی ضرورت ہے۔

مقامی سماجیات کا شعور' مرزا حامد بیگ کے ہاں سیاسی نعرہ بازی سے پاک ہے لیکن سیاسی شعور بہرطور موجود ہے جسے ہم عصر انسان کے دکھ کا شعور کہنا چاہیے۔ اس بے چارگی کا احساس جو تاریخ کے اس غیر معمولی مرحلے پر ادھر مسلط کر دیا گیا۔

وہ انسان جو مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں ہمارے سامنے آیا ہے دوستوفسکی یا موپاساں کا انسان نہیں بلکہ یہ تو کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کے کرداروں کی بھی اگلی نسل ہے۔ مجبور و مقہور انسانوں کی اس دھرتی پر پھیلی ہوئی پستیوں کا یہ سماج مغل گھڑسواروں اور تیراندازوں کی کہانیاں سے ضرور اگا ہے مگر اس کا اپنا انداز بڑا دھیما اور آہستہ رو ہے۔ مرزا حامد بیگ کے تخلیق کردہ' اپنی دھرتی سے ہم آہنگ کردار' جارحیت پسند نہیں' دکھ سہتے ہیں مگر شور و غوغا نہیں کرتے۔

اپنے گرداگرد کے انسانوں کو خود ان کے ذہنوں پر منکشف کرنا ہی نظری خودکفالت کی بنیاد ہے۔ مرزا حامد بیگ میں یہ فنی صلاحیت بہت زیادہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو خود اس کے خارج سے نکال کر خود اسی کے روبرو رکھتے جاتے ہیں۔

وہ لوگ جنھوں نے شولو خوف' گورکی' موپاساں اور بالزاک کی تحریریں دیکھی ہیں اور جنھوں نے منٹو' احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کو بھی پڑھا ہے' وہ جانتے ہیں کہ بڑے تخلیق کاروں میں انیس بیس کا ہی فرق ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنے دکھ' اپنے وجدان اور اپنی قلبی واردات کے حوالے سے ہی دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ فرق صرف اس معروضی رابطے کا ہی ہوتا ہے جو

ادیب اپنے اردگرد سے پیدا کرتا ہے۔ اسی سے وہ ایک خیالی انسان کی تشکیل کرتا ہے جس کی ملاوٹ وہ اپنے تخلیق کردہ کرداروں میں غیر محسوس انداز میں کرتا جاتا ہے' یہاں تک کہ وہ اپنے عہد کے انسان کا حلیہ تراشتے اور نکھارتے ہوئے اس پر آلودگی مسلط کر دیتا ہے۔ فن کے پرستاروں کو وہ آلودگی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اس نکھار کی بات کرتے اور داد دیتے ہیں' اور اگر یہ خیالی انسان مفقود ہو تو تخلیق کار اپنا آپ اپنے کرداروں میں داخل کرتا ہے۔ مرزا حامد بیگ کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ ان کے کردار ان کے اس حد تک اپنے ہیں کہ وہ خود کرداروں میں ڈھل گئے ہیں مگر یہاں خوش قسمتی یہ ہے کہ مرزا حامد بیگ عام انسانوں سے ذرا بھی مختلف نہیں۔ انہوں نے اپنے کرداروں کے چہرے آلودہ نہیں کیے' ان کا تشخص برباد نہیں کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے قاری کے لیے اپنے افسانوی کرداروں میں اتر جانے کی بڑی جگہ چھوڑی ہے۔

منٹو کے افسانے پڑھ کر قاری جگہ جگہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر کہانی منٹو کی اپنی کہانی ہے مگر قاری کبھی بھی یہ اعلان نہیں کرتا کہ منٹو کا تخلیق کردہ کردار وہ خود ہے' جبکہ مرزا حامد بیگ کا قاری یہ اعلان بڑے زوردار انداز میں کرتا ہے کہ وہ خود ہر افسانے میں موجود ہے۔ اس دھرتی کے وجود اور اس کے کرداروں سے یہ ہم آہنگی' آگہی اور خودشناسی ہی افسانہ نگار کا کمال ہے جو اسے تاریخ کے اس حیرت انگیز مرحلے پر اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے گھر ہی کی روشنی پر اکتفا کرے اور فکری تساہل پسندی کے گمراہ کن جبر سے آزاد رہ کر اپنا کام کرتا جائے۔ بصورت دیگر اس کی ہم عصر نسل اجرتی مزدور کی سطحی تاویلوں سے گمراہ ہو کر اپنے تشخص کی پناہ گاہیں توڑ دے گی کہ اسے ہمارے وجود کی قبر سے دوسرے سرکردہ مجاوروں خصوصاً سیاستدانوں سے کسی نظریاتی راہنمائی کا فیض حاصل نہیں۔

○

مرزا حامد بیگ کے تین افسانوی مجموعوں "گم شدہ کلمات"، "تار پر چلنے والی" اور "قصہ کہانی" کے بعد افسانہ "انتظار گاہ" ان کے تخلیقی سفر کے اس چوتھے پڑاؤ پر ایک ایسا قطبی ستارہ ہے جسے مرزا حامد بیگ کے اس فنی سفر کا مرکز و محور کہنا چاہیے۔

اس افسانے میں سیدھے سبھاؤ ہمارا فسانہ نگار اپنے کرداروں کی وساطت سے زندگی کے ان لمحوں کی نشاندہی کرتا ہے جو اسے اپنی سیدھی سادی دنیا پر مسلط طاغوت کی موجودگی کا شعور بخشتے ہیں۔ وقت کا شدید جھٹکا اسے اس بچپن اور لڑکپن کی سرحدوں سے باہر پھینک دیتا ہے۔ باہر جہاں زندگی کی حقیقتوں کا ٹھٹھرا دینے والا جاڑا سرگرم عمل ہے جسے ہڈیوں پر سہے بغیر سوچ اور فکر کا ارتقاء ممکن ہی نہیں۔

افسانہ "انتظار گاہ" کا یہ بھرپور فکری اور نظری شعور ہی ہمارے سماج کی داخلی صلاحیت ہے جو خارج کے طاغوتی جبر کے سامنے زندگی کی ضامن ٹھہرتی ہے۔ یوں "گناہ کی مزدوری" کے تمام افسانے "انتظار گاہ" ہی کی مختلف سمتوں میں ترقی پذیر ہونے والی تخلیقی صلاحیتیں ہیں۔ تین مختلف پگڈنڈیاں۔

پہلی پگڈنڈی "سانڈنی سوار"، "حکم نامہ"، "راجا جی کی سواری" اور "گناہ کی مزدوری" سے ذرا کنی کھا کر "پھیری والا" اور "لاکرز میں بند آوازیں" تک نکل جاتی ہے۔ اس میں "پھیری والا" اور "لاکرز میں بند آوازیں" افسانہ نگار کے سیاسی شعور کی پیچیدہ اور سادہ صورتیں ہیں جبکہ "سانڈنی سوار"، "حکم نامہ"، "راجا جی کی سواری" اور "گناہ کی مزدوری" یہ چار افسانے اس رچاؤ کے حامل ہیں جس میں افسانہ نگار کی فنی صلاحیت اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔

ان افسانوں میں ہمیں کسی قسم کا فنی جھول یا نظریاتی گمرہی دکھائی نہیں دیتی۔ معروض میں پھیلے زندگی کے دکھوں کو ان کی شہ رگ سے پکڑنے کا یہ بے باکانہ عمل ہی عہد حاضر کا وہ تقاضا ہے جسے نباہے بغیر ہمارا ادیب اپنی دھرتی کا قرض نہیں اتار سکتا۔

"سانڈنی سوار" علامتی سطح پر نہایت بھرپور افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ہمیں ہماری سماج کے اس داخل تک اتار لے جاتا ہے، جہاں غیرمرئی طور پر فرسودگی فکر جڑیں کر چکی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ فرسودگی فکر کے اس نظام میں سے بغاوت کے سرچشمے نہیں پھوٹتے البتہ شعوری ابھار آگہی کی منزلوں کی سمت رواں ہے:

"ایک طالب العلم نے ڈرتے ڈرتے صرف اتنا کہا:
بھائیو۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو اعلیٰ حضرت سے بھی بازی لے گیا۔"

(افسانہ : سانڈنی سوار)

بے شک، سماجی جکڑبندیوں میں شکستگی کا ادراک ہے۔

"حکم نامہ" سماجی جدل کی نمائندگی کرتا ہوا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اپنے قاری تک جو پہلا تاثر پہنچاتا ہے وہ افسانہ نگار کے دیہی پس منظر پر خارج کے اندھے جبر کے مسلط ہونے کا تاثر ہے۔ یہاں "سانڈنی سوار" کی طرح اس جبر کے خلاف باغیانہ سرگرمی دربارشاہی سے ہی بھیجے گئے ایک کارندے سے سرزد ہوتی ہے۔ تاوقتیکہ دوسرا کارندہ آتا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

"تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں جس مقصد کے تحت یہاں آیا ہوں، اس لعین کو بہت پہلے اسی کام کی خاطر بھیجا گیا تھا۔" اس نے یہ کہا اور اپنی کمر سے لٹکتے ہوئے خنجر کو ایک جھٹکے کے ساتھ کھولا، فضا میں لہرایا اور پلک جھپکتے میں اس یخ بستہ بوڑھے وجود میں اتار دیا۔"

(افسانہ : حکم نامہ)

"گناہ کی مزدوری" میں ایک تمثیل کو ابھارا گیا ہے جو عصر حاضر کا سچ ہے۔ حضرت عیسیٰ کو مغلوب کرنے والی قوتیں ہمارے عہد کے پھانسی گھاٹ کے پیچھے کھڑی صاف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ وہ سچ ہے جو سالہا سال کوڑوں کی زد میں رہا ہے۔

بلاشبہ "گناہ کی مزدوری" اس مجموعے کے سارے افسانوں میں سب سے زیادہ علامتی افسانہ ہے' جسے عہد حاضر کا معمولی ادراک رکھنے والا قاری بھی پوری طرح سمجھ لیتا ہے اور یوں عہد عیسیٰ کی کہانی کہیں دور پس منظر میں چلی جاتی ہے اور ہمیں اپنے گلی کوچوں میں پھیلا' سیاسی آسیب' فریسی بزرگوں کے مکروہ چہروں سے اڈتا صاف دکھائی دیتا ہے۔

"داستان گو یہ بتانے سے معذور ہے کہ سبت کی رات حاکم کے کارندوں میں سے کس نے قرعہ جیت کر ارغوانی چولا حاصل کیا' اور اس مہین دوشالے کے ٹکڑے کیا ہوئے جو قبر کے کھل جانے پر وہاں سے برآمد ہوئے تھے۔

اس گناہ کی مزدوری کو پشت ہا پشت سے سینت سینت کر رکھنے والوں میں سے کس کا حوصلہ ہے اور وہ کیوں کر دعویٰ کرے کہ اس چرواہے کی کمر کو اس کے پرکھوں نے ننگا کیا؟"

(افسانہ : گناہ کی مزدوری)

اب اگر "سانڈنی سوار" "حکم نامہ" اور "گناہ کی مزدوری" کے تسلسل میں "راجا جی کی سواری" کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس داخلی فروغ کی خبر ملتی ہے اور جس میں ہمیں ہماری انٹروورٹ دھرتی انگڑائی لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تیسری دنیا کی عوامی تحریکوں کے مقابل شکست کھائے ہوئے بے بس راجا کا فرار بظاہر ایک روائتی قصہ ہے لیکن درحقیقت یہ افسانہ اس سماجی نفسیات کا نمائندہ ہے جو فرانسیسی زوال پسندوں کی طرح جارحانہ نہیں ہے اور جس میں ہماری دھرتی کا صبر و یقین اور اعلیٰ انسانی فراست ابھی ثابت قدم ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے راجا کے مدمقابل سیاسی لہر سے مغلوب ہو کر اپنے آپ کو سطحی قسم کی ترقی پسندی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ یہی ہمارے سماج کا اپنا پن ہے' جس کے مختلف روپ مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا منفرد لہجہ ترتیب دیتے ہیں۔

افسانہ "پھیری والا" اور "لاکرز میں بند آوازیں" اس مخصوص شہری شعور سے ابھرے

ہوئے افسانے ہیں جسے مصنف نے اکثر بچا بچا کر رکھا ہے اور یہاں اپنے مخصوص دیہی پس منظر کی ابن خلدون والی نسلی عصبیت سے آزاد رہ کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان افسانوں کے ذریعے مرزا حامد بیگ نے اپنے قاری کو ادراک کی ان سرحدوں پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وقت اور فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ یہاں افسانہ نگار کی تخلیقی صلاحیت ایک نئی کروٹ لے رہی ہے۔ وہ راز جو "انتظار گاہ" کے "سنگی حصار" سے کھلے اور فکے کے کندھوں پر چڑھ کر معلوم ہوا تھا، اب سنسان سڑکوں پر دوڑتی پھرتی سماجی حرکت کے انگ انگ سے نمایاں ہے اور "پھیری والے" کی ناوقت موت کا غم ہم ان گنت صدیوں سے جھیل رہے ہیں۔ ایسے میں ہمیں "لاکرز میں بند آوازیں" سنائی دیں اور اس بات کا شعور نصیب ہوا کہ ہمارے معروض کی دنیا میں سرحدوں کے اس پار کی گماشتگی ہماری انٹروورٹ سائیکی کی بدولت اپنا وجود مسلسل بچاتی چلی جا رہی ہے۔ مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا عطا کردہ یہ شعور برصغیر کی اہلیت کو اس کے وجود سے باہر لانے اور اس کے صحیح ناک نقشے کے ساتھ متعارف کروانے کے سلسلے کا پہلا قدم ہے۔

○

"گناہ کی مزدوری" میں مرزا حامد بیگ کے افسانوں کی دوسری پگڈنڈی افسانہ "دستک"، اینگلو انڈین لڑکی کی کہانی" اور "جنم جوگ" پر مشتمل ہے۔ "دستک" اور "جنم جوگ" قاری کو شہری سماجیات کا ادراک بخشتے ہیں جبکہ "اینگلو انڈین لڑکی کی کہانی" ہمارے دوغلے پن کی عکاس ہے۔

یوں تو زوال پذیر معاشروں کا تخلیق کار انسانوں پر مسلط دکھ کو تخلیقی قوت میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ایسا دکھ اور نوحہ جو ایک ماتمی نسل سے دوسری ماتمی نسل تک اور پھر اس سے اگلی نسل تک منتقل ہوتا رہے تو انفرادی احساسات سے کہیں زیادہ تہذیبی اور معاشرتی روگ جنم لیتے ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ زوال پذیری کا عمل اپنی پوری شد و مد کے باوجود ہمارے سماجی دھارے کو روک دینے میں کامیاب نہیں ہوا، اور یہ تاثر مرزا حامد

کے افسانوں میں موجود ہے۔

گزشتہ کئی نسلوں سے یہ دکھ ہمارا تہذیبی رویہ بنا ہوا ہے اور ہمارے تمام تر کیف و وجدان کے سرچشمے اسی کرب سے پھوٹ رہے ہیں۔ حقیقتاً کوئی بھی تہذیبی رویہ ہیجانی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت بڑی انقلابی چیخ و پکار کے باوجود "ترجمے کا پروردہ" دانشور ہمارے سماج کے دھیمے پن اور گہری دروں بینی کو ماردھاڑ کے سیاسی عمل میں تبدیلی نہیں کر سکا، گو سماج کی آہستہ رو حرکت اس پر پسماندگی کا ہیولا تو مسلط کرتی آئی ہے لیکن یہ اس کے روبہ زوال ہونے کی دلیل ہرگز نہیں۔ ہمیں مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں فیض احمد فیض کی شاعری کی طرح ان بیدار ہوتی قوتوں کا نشان ملتا ہے جو ہمارے شاندار مستقبل کو وارد کرنے کی خودکفیل صلاحیت رکھتی ہیں۔

"دستک" اپنی نوع کے اعتبار سے ہمارے سماج میں وقوع پذیر ہونے والی ایک روز مرہ کی واردات ہے۔ یہاں اجی کے روٹھے اور کوکی کی حالت زار سے بلاشبہ ایک دکھ ابھرتا ہے لیکن یہ دکھ ہی افسانے کا مکمل تاثر نہیں بلکہ اس کا شعوری احساس، جو افسانے میں ہر جگہ موجود ہے ان سماجی اور انفرادی قوتوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کی طرف میں نے فیض کے حوالے سے اشارہ کیا۔

ہمارے معاشرے میں ان قوتوں کا حرکت پذیر وجود ہی ہماری زندگی کی اساس ہے اور یہی تو ہے جس نے خارج سے زوال کے حملے کو صدیوں تک روکے رکھا ہے اور ابھی اس کی مزاحمت جاری ہے۔ شاید کسی اور معاشرے میں اتنی قوت نہیں کہ اپنے وجود کو پورے کیف و وجدان کے ساتھ اتنی زیادہ مدت کے لیے زندہ رکھ سکے۔ شاید فرانسیسی سماج میں بھی نہیں، جسے یورپ کی زبردست صنعتی ترقی اور اناطول فرانس، وکٹر ہیوگو، موپاساں، ایمائل زولا، ستاں دال اور گستاؤ فلائیبر جیسے سہارے بھی تاریخ نے مہیا کیے اور جنہوں نے اسے بار بار زندگی سے دوچار کیا۔

"جنم جوگ" سماجی عمل میں فرد کے شب و روز کی بے چارگی کا تاثر ابھارتا ہے لیکن یہ

بھی افسانے کا اصل موضوع نہیں۔ یہ افسانہ نمائندہ ہے اس تخلیقی عمل کا' جو افسانہ نگار کو سماج کے داخل کا ادراک بخشتا ہے' جہاں وقت اور جغرافیے کی تمام تر حدبندی انسان کو اپنا قیدی بنانے میں ناکام رہتی ہے۔ سارے دکھ اور شکست و ریخت مل کر بھی آنکھ کی بینائی کو برباد نہیں کر سکتے۔ زندگی اور روشنی کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ انہیں احساسات کے تاثر میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اپنی ذھنی کیفیات کو زندگی کے ادراک کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہی "جنم جوگ" کا مرکزی نقطہ ہے۔

○

اب آیئے "کارنیوال" "پھول بانٹنے والا" "مہابلی" "اندھی گلی" "ملاقات" اور "آوازیں" سے گندھی ہوئی اس تیسری پگڈنڈی کی طرف۔ جو بنت اور بیان میں یکسر انوکھی ہے۔

"اس نے پلٹ کر نگاہ کی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ بس درختوں کی دو رویہ خاموش قطاریں تھیں جو گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ہی قدموں کی چاپ سن رہا تھا۔

اب آگے بڑھنے کا وہ جوش و خروش نہیں رہ گیا تھا' جو اسے یہاں تک لے آیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ کارنیوال تک کا سفر طے کر آیا تھا' لیکن سڑک تھی کہ کپڑے کے لپٹے ہوئے تھان کی مانند اس کے سامنے کھلتی ہی چلی جا رہی تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی زیرِتعمیر سڑک پر نکل آیا ہو۔ لیکن یہ ایک مضحکہ خیز خیال تھا' پر اس دنیا کے میلے میں یہ انسانی تماشا کچھ کم مضحکہ خیز ہے' اس نے سوچا۔"

(افسانہ : کارنیوال)

"کارنیوال" کا موضوع وقت اور اس کے متعلقات ہیں۔ کارنیوال کا میکانیکی وجود جن سمتوں کا تعین کرتا ہے اور قاری کو جس صورت حالات سے دوچار کرنا چاہتا ہے وہ بذات خود افسانے کی تکنیکس کی ہی نفی ہے۔ کارنیوال تو سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور زندگی کے اردگرد ابھاری گئی تمام تر جکڑبندی سراسر مصنوعی ہے یا اس کا فرد کی ذہنی کیفیات پر کوئی اثر ہی نہیں ہے۔ یہ درحقیقت سماج میں فرد کی شرکت کے اس مرحلے کا تاثر ہے جب فرد اندر ہی اندر سماج کی مصنوعی جکڑبندیوں سے بیزار ہونا شروع ہوتا ہے۔

ہم سماجی ارتقا کے ایک ایسے ہی موڑ پر کھڑے ہیں لیکن اس کا ادارک نہیں رکھتے۔ یہ افسانہ ہماری ذہنی صلاحیتوں کو ہمارے معروض سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے جبکہ وہ خوف جو "مہابلی" کی سطروں سے ابھرتا ہے، اگر تاریخی عمل کا گہرا شعور اپنے اندر جذب کرلے تو کم از کم ان سماجی راہوں کا سراغ مل جائے جو مہابلی کے جبر سے آزاد بستیوں تک نکل جاتی ہیں۔

"ملاقات" اور "پھول بانٹنے والا" بھی "کارنیوال" کی طرح ان ذہنی کیفیات پر لکھے گئے افسانے ہیں جو فرد کو خود اپنی تلاش کے عمل سے دوچار کرتے ہیں۔ ان افسانوں سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ وجود کی مصنوعی نفی اس کی اپنے آپ پر مسلط گم شدگی ہے۔ یوں یہ اپنی تلاش کے ساتھ ساتھ اس سماج کی نشاندہی کے افسانے بھی بن جاتے ہیں جسے اب وقوع پذیر ہو ہی جانا چاہیے کہ پہلے سے موجود معروضی سماج ایک خارجی لا-معنیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

ان افسانوں کی وہ تمام تر پراسراریت جسے دانستہ طور پر افسانہ نگار نے ہم تک پہنچایا ہے درحقیقت زندگی کا وہ مصنوعی تاثر ہے جو اپنے داخل کی طرف سمٹ جانے کے عمل کے ساتھ ساتھ بے معنی انداز میں باہر کی دنیا کا ادراک حاصل کرنے کا ڈھونگ ہے۔ بلاشبہ فرد میں تاریخی طور پر وہ صلاحیت سرے سے موجود ہی نہیں کہ وہ اپنے معروض سے بھاگ کر کلی طور پر اپنے داخل کے غاروں میں چھپ جائے۔ اس لیے کہ جب معروض کی نفی ہوتی ہے تو انسانی داخل کی وجودیت بھی تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہ انسان کی مجبوری ہے کہ اسے دونوں مقامات پر زندہ رہنا ہے۔

"ملاقات" میں آخرکار مستقبل وارد ہوتا ہے اور "پھول بانٹنے والا" اپنے اردگرد سے کسی طور بھی کٹ نہیں جاتا۔ یہی وہ حوصلہ افزا تخلیقی عمل ہے جو خوف اور جبریت سے فرار حاصل کرتی ہوئی وجودیت کو کارزار حیات میں مکمل شکست سے دوچار نہیں ہونے دیتا۔ اسی طرح "آوازیں" اور "اندھی گلی" بڑی واضح صورتوں میں اس بڑھتے ہوئے تخلیقی عمل کی نشاندہی کرتے ہیں جس کا ذکر "ملاقات" اور "پھول بانٹنے والا" کے ضمن میں کیا گیا۔

اپنی پراسرار فضا کے باوجود یہ سیدھے علامتی افسانے ہیں جو معروض کی سچائیوں سے انفرادی سائیکی کو ہم آہنگ کرتے ہیں اور یہی وہ تخلیقیت ہے جو سماجی ارتقا کا رخ موڑنے کے سفر کا اگلا قدم ہے۔ یہ افسانے پڑھ کر یقین ہو چلا ہے کہ ہمارے سماج کے اندر کہیں بہت قریب ان زبردست انقلابی صلاحیتوں کا خزینہ موجود ہے جس نے ایک دن ہمارے ماحول کی بے چارگی، دربدری اور مفلسی کو روشنی اور سچائی کی معروضیت میں بدل دینا ہے۔

○

ہر بڑا تخلیق کار نئی لفظیات کے ساتھ ظہور پاتا ہے، خصوصاً وہ باشعور اور وسیع النظر ادیب جو تکنیک اور ساخت سے آگے نکل کر لفظ کی ماہیت اور حقیقت جاننا چاہتا ہے نیز لفظ کے حوالے سے یہ آگہی درحقیقت تہذیب کے پورے تاریخی عمل کی آگہی ہوتی ہے۔ یہ الگ حقیقت ہے کہ ہر تہذیب کا دور عروج غیرمحسوس انداز میں اپنے زوال کا پیش خیمہ بھی ہوتا ہے اور اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جب ہم تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے کے لیے اپنی تخلیقیت یا لفظ کی قوت کو استعمال کرنا چاہتے ہیں تو درحقیقت ہم تاریخی اعتبار سے تاریخ کے میکانیکی عمل کا ہی حصہ ہوتے ہیں۔ یوں ہماری حیثیت ایک روایت کے پیروکار کی سی ہوتی ہے یعنی جب ہم اپنی

دانست میں نئے لفظ تراشتے اور نئی تخلیق کی پیدائش کے لمحے سے گزر رہے ہوتے ہیں تو دراصل ہم تاریخ کے تقاضوں کو ہی نبھا رہے ہوتے ہیں۔ پھر ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب رجعت پسندی اور انقلاب پسندی کی اصطلاحیں اپنے حال کے لمحے سے بیزاری کا اظہار کرتی ہیں۔ علمی نظریات سے ہم اس کی جو بھی تاویلیں پیش کریں مگر ایک بات ماننی پڑتی ہے کہ جب ہم وقت اور تاریخ کو پیچھے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں تو دراصل ہم حال کے لمحے کو قبول کرنے سے انکاری ہوتے ہیں اور جب ہم تاریخ اور وقت کو اپنے تخیلاتی جہان میں دھکیل دینا چاہتے ہیں تب بھی ہم درحقیقت حال کے لمحے کو رد کر رہے ہوتے ہیں' لیکن یہ انسانی مقدر ہے کہ ہمارا عمل اور ہماری لگاوٹ کا تعین بہرطور لمحہ موجود کے حوالے سے ہی ہوتا ہوتا ہے۔ وہ لمحہ حال' جو خود ہماری طرح وقت کی کوکھ سے برآمد ہوتا ہے اور جو ہمارے وجود اور ہماری نفسیات کے ساتھ بڑی گہرائی میں جڑا ہوا ہوتا ہے۔

تخلیق کار اپنی تخلیق کے اعلیٰ ترین مراحل میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس رابطے کا گہرا شعور اپنے لفظوں میں نہیں اتار لیتا' یعنی جو ادیب اپنی دنیا سے کٹا ہوا ہے' اس کا کسی دوسری تخیلاتی دنیا سے ارتباط بھی قابل بھروسہ نہیں۔

مرزا حامد بیگ نے لمحہ حال سے مکمل اور مادر پدر آزاد بغاوت کرنے سے انکار کیا ہے۔ وہ اپنی اردگرد کی دنیا سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے تو داستان اور کہانی کے تاثر میں ڈوبے ہوئے اذہان تک اپنے افسانوں کی ترسیل کی ہے۔ افسانہ "گناہ کی مزدوری" کا مطالعہ کرتے ہوئے وقت کا گہرا شعور رکھنے والا قاری بڑی آسانی سے اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ افسانہ ایک نقطہ نظر ہے' ایک زندہ ذہن کا اپنے اردگرد کے جبر پر احتجاج ہے۔ اس افسانے کا قاری جس قدر بالغ نظر ہو گا اسی قدر بائبل کی یہ قدیم روایت پیچھے ہٹتی چلی جائے گی' اور یہی افسانہ نگار کا طے شدہ مقصد ہے۔

یہاں مجھے انتظار حسین اور مرزا حامد بیگ کا تقابلی فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ انتظار حسین

کی بیان کردہ داستانوی تمثیل اور نظری رویہ باہم مل کر قاری کو آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں اور یوں انتظار حسین کا قاری نادانستہ طور پر ماضی پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ انتظار حسین کا مقصد ہے یا نہیں، اس پر بحث نہیں۔ لیکن انتظار حسین کے ہاں لمحہ موجود کے جبر کو مدمقابل پا کران کا قاری پیچھے کی طرف ہٹتا ہے تو اسے فرار کی راہ ضرور مل جاتی ہے۔ یہ بغلی راستہ کسی طے شدہ پناہ گاہ کے بغیر بے عملی اور شکست خوردگی کی طرف ہی لے جائے گا۔ جب کہ مرزا حامد بیگ کے افسانے ایک ایسا تاثر پیدا کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں جو حال کے موجود لمحے اور مستقبل سے متعلق ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ مرزا حامد بیگ افسانہ نگار کی سرحد عبور کر کے مبلغ کا روپ نہیں دھارتے، جیسا کہ اشفاق احمد کے ہاں ظاہر ہوا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اشفاق احمد جیسا مبلغ افسانہ نگار بھی قاری میں نئی دنیاؤں کی طرف مائل بہ سفر ہونے کا عملی رجحان پیدا کرنے کی بجائے اسے روایت کے ساتھ اس حد تک جوڑ دیتا ہے کہ اس کا قاری لمحہ حال کی شناخت کر لینے کے باوجود حال سے ماضی کی طرف کا ہی رخ کرتا ہے۔ یوں انتظار حسین اور اشفاق احمد ماضی پرستی کی حد تک "موجود حالت" کے محافظ دکھائی دیتے ہیں۔

ابن خلدون اور ٹائن۔ بی کے خیال میں کوئی بھی عہد تہذیبی اور فنکارانہ صلاحیتوں سے بانجھ نہیں ہوتا اور ہر عہد کلاسیک کو جنم دے سکتا ہے۔ اب اگر اس نظریے کو درست بھی مان لیا جائے، تب بھی سماج کی اپنی خودکفالت کی نفی نہیں ہوتی، نیز کوئی بھی عہد اس صلاحیت سے اپنے آپ کو مکمل پور پر الگ نہیں رکھ سکتا جو ارتقاء کے عمل نے اس تک پہنچائی ہوتی ہے اور ہر دور انحطاط انسانی مقدر کی بحالی کا ہی جواز مہیا کرتا ہے۔

ہمارے بیشتر تخلیق کاروں کا یہ الجھاوا ابھی دور نہیں ہوا کہ ہم ماضی کے سنہری دور سے دور انحطاط کی جانب سفر کر رہے ہیں یا ایک نئے اور شاندار مستقبل کے کٹھن اور پر آلام سفر کے مسافر ہیں، اور یہیں سے ہمارے رویوں کا تعین ہوتا ہے۔ یہاں ٹائن بی اور ابن خلدون، دونوں سے اختلاف ممکن ہے، اس لیے کہ انسان کا سفر کبھی بھی روبہ زوال نہیں ہوتا البتہ ایک شاندار

مستقبل کا سفر مقامی اور میکانکی نوعیت کے مسائل سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔

ہر عہد کے عروج و زوال کو شخصیتوں اور خاندانوں کے حوالے سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی عادت غیرسائنسی رویہ ہے جو ہمیں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ یوں ہم اپنی تاریخی صلاحیتوں سے دست بردار ہوتے جاتے ہیں۔ یہیں سے ماضی پرستی ہمیں اپنی لپیٹ میں لیتی ہے' جس کا کام معاشروں کو بانجھ کر کے رکھ دینا ہے۔ اس بانجھ پن کے جبر سے ابھرنے والا ہر لفظ لذت گوش کا سطحی فریضہ ادا کر کے گزر جاتا ہے اور ہم بے نظری کی دلدل میں دھنسے رہ جاتے ہیں۔

زندہ لفظ انسانوں کے باہمی ربط کی صورت ہے۔ لیکن اگر ادب اور انسان بے ارادہ وجود کی مانند کائناتی قوتوں کے تسلط میں رہتے ہیں تو یہ ان دونوں کی بے وقعتی ہے بلاشبہ ابن خلدون' ٹائن۔ بی اور "گناہ کی مزدوری" کے فریسی بزرگوں نے اس انسانی بے وقعتی کو ترویج دی ہے اور یہی کام ہمارے ماحول پر مسلط' راز کی ٹوہ میں رہنے والی قوتوں نے بھی کیا ہے۔ جو ہمارے ادب پر بانجھ پن مسلط کر دینا چاہتی ہیں۔ یہ سب کے سب وقفوں وقفوں سے اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتے چلے آئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے اذہان میں اتنی آلودگی بھردی ہے کہ اب ہم اس ماحول میں رچ بس سے گئے ہیں۔

کہتے ہیں کہ رستم جب اپنے بیٹے سہراب کو قتل کر چکا تو اس پر یہ راز کھلا کہ وہ محض سہراب ہی کا نہیں اپنی آئندہ نسلوں کا بھی قاتل ہے۔ تب اس نے بیٹے کی لاش اپنے کندھے پر اٹھائی اور ایران کی گلیوں میں دیوانوں کی طرح یہ کہتا پھرا کہ: "یہ میرا بیٹا ہے اور اسے میں نے خود قتل کیا ہے۔" ہم نے بھی ایک نسل کا قتل دیکھا ہے۔ وہ پوری نسل' جو آج ہماری گلیوں میں اور سڑکوں پر بے مہار' ازخود رینگتی پھرتی ہے اور جسے رستم جیسا باپ بھی نصیب نہیں ہوا۔ اس کا کوئی وارث نہیں' نہ علمی درس گاہوں میں اور نہ شہر کی سڑکوں پر۔ یہ نسل مسیح ناصری کی ہڈیوں کے ڈھانچ کی طرح بیچ چوراہے میں پڑی ہے اور مرزا حامد بیگ کے افسانے "حکم نامہ" کا

جلاد اسے دفنانے بھی نہیں دیتا۔

یہ بڑی کمینگی ہو گی کہ ہمارا دانش ور اس صورت حالات کو دور انحطاط قرار دے کر ٹائن۔ بی کی طرح وحشیوں کے حملے کا انتظار کرے یا پھر ابن خلدون کی طرح بے بس حکمرانوں کے سامنے خونی بغاوتوں کا جواز پیش کرے۔ مرزا حامد بیگ نہ تو وحشیوں کے حملے کے منتظر ہیں اور نہ خونی بغاوتوں کے لیے جواز تراشتے ہیں۔ وہ تو اس سارے عمل اور رد عمل کو قبول کرتے ہیں اور اس طرح کی قبولیت ہی تو ہمارے ہاں نایاب ہے۔

○

تاریخ پر نظر رکھنے والے ایک گروہ کا خیال ہے کہ ہر تہذیب اپنے نقطہ عروج پر پہنچ کر کرچی کرچی ہو جاتی ہے۔ روبہ زوال ہونے کا یہ مرحلہ تہذیبی رکھ رکھاؤ بگاڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس کا براہ راست پہلا شکار انسان ہی ہوتا ہے۔

تاریخ کو سمجھنے کا سادہ سا طریقہ یہی ہے کہ اسے انسان کے وجود کے حوالوں سے سمجھا جائے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم غیرشعوری طور پر انسان کو خارج کے سارے عمل کا تابع کہہ دیتے ہیں' حالانکہ تاریخ اور وقت کے بہاؤ میں جس کسی نے بھی اپنے تشخص کو برقرار رکھا ہے وہ خود انسان ہی ہے۔

تہذیبی رکھ رکھاؤ انسان کے بطن سے باہر ایک خارجی قوت ہے اور اس قوت کی ٹوٹ پھوٹ اور اس سے پیدا ہونے والا بگاڑ ایک ایسا خارجی عمل ہے جس نے کبھی بھی انسان پر اپنی اجارہ داری قائم نہیں کی۔ ایسے خارجی دباؤ کی زد میں آ کر انسان کی تعمیر کے تمام نقطہ ہائے نظر رجعت پسندانہ ہی رہتے ہیں اور زبان بھی اسی تہذیبی رکھ رکھاؤ کی ایک قدر ہے' انسان کا ایک خارجی حوالہ' جو تہذیب کی ٹوٹ پھوٹ کے لمحے میں ازخود بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔

مرزا حامد بیگ کی زبان ایک طرف تو نذیر احمد دہلوی اور محمد علی ردولوی جیسے ماسٹرز کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور دوسری طرف زبان کے عالمگیر ارتقائی عمل کا حصہ ہے۔ یہ زبان تاریخ کے اس مرحلے پر لسانی اور تہذیبی اصول و ضوابط کے اعتبار سے اب بھی ارتقا پذیر ہے اور ایک لحاظ سے تو دوسرے معاشرتی عوامل کے مقابلے میں اس کا خالص پن اور ترقی پذیری کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ لسانی حوالے سے یہ کرپشن کی زد میں ہے' یا ہو سکتی ہے۔ یاد رہے کہ دوسری علاقائی زبانوں کی جارحانہ وکالت نیک نیتی کے باوجود ایک غیر علمی رویہ ہے اور اس سے احتراز لازمی ہے۔

بلاشبہ اردو زبان اپنی جغرافیائی دربدری کے باوجود اب ہمارے گلی کوچوں میں بڑے پروقار انداز میں گھل مل گئی ہے۔ اس لکھی اور بولی جانے والی مقامی زبانوں کا باہمی تال میل مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں دوسرے کسی بھی ہمعصر افسانہ نگار سے زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر ہم اردو کو اس کے جدی پشتی اجارہ داروں سے آزاد ایک ارتقاء پذیر زبان قرار دیتے ہیں۔ ہم اپنے تخلیق کار کی گردن زبان کے دقیانوسی پھندے میں پھنسی ہوئی نہیں دیکھنا چاہتے اس لیے پنجابی ہوتے ہوئے ہم بخوشی یہ اجازت دیتے ہیں کہ ہمارا تخلیق کار اپنی اور اپنے معاشرے کی قلبی واردات کو اسی زبان میں بیان کرے۔ اس لیے کہ مرزا حامد بیگ نے خارج میں انسانی صلاحیتوں سے فروغ پانے والی تہذیبی رکھ رکھاؤ کی اس قدر کو ادارہ جاتی شکلوں میں انسانی ذہن پر مسلط کرنے کا رجعت پسندانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ مرزا حامد بیگ نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے اس قدر کو ایک نئی زندگی دینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اس بات کی سچائی ثابت ہوئی کہ ہمارا انسان تاریخ کے اس مرحلے پر بھی نہ صرف ارتقا پذیر ہے بلکہ اپنی فنی اور ذہنی صلاحیت سے اپنے خارج پر حاوی ہے۔ مرزا حامد بیگ کے افسانے کو بھی تاریخ کے اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے اور اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ مرزا حامد بیگ کی زبان اور ان کا خیال تاریخ کی ترقی پذیر قوتیں ہیں تو یقیناً ہم اس تخلیق کے مخصی حوالے کو منہا کرتے ہوئے

اسے انسانوں کی ایک آفاقی صلاحیت اور اہلیت ہی قرار دیں گے۔ یوں ہم مرزا حامد بیگ کو بطور تخلیق کار، تاریخ کے بہاؤ کے سامنے وہ وجود قرار دے سکتے ہیں جو درحقیقت ہمارے سماج کا نمائندہ وجود ہے۔

مرزا حامد بیگ کے افسانے ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھے ہیں جہاں انسان اپنے سماج کی گہرائیوں میں دور تک اترا ہوا ہے اور اپنے اردگرد کے ہمہ گیر ادراک کا مالک ہے۔ اس کی اپنے ماحول پر کڑی گرفت ہے اور وہ زندگی کا گہرائی کے ساتھ احاطہ کرتا ہے۔ ان افسانوں میں زندگی، سماج، ماحول اور وقت کی کڑیاں ایک انسانی سائیکی ترتیب دیتی ہیں جو اپنے وجود میں قدرتی پن کی حامل ہیں۔ جہاں انسان، انسان سے قریب ہی نہیں بلکہ اس بات کا شعور بھی رکھتا ہے کہ وہ کتنا کتنا کس کس میں گھسا بیٹھا ہے۔ انسان کے اندر بہت دور تک شناسائی حالت بیان میں آئے بغیر اپنے عہد کی بھرپور وجدانی کیفیت ہے جو ان کے افسانوں میں اڈتی اور چھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

مرزا حامد بیگ پر اپنے عہد کے ادب کا ورود اس وقت شروع ہوا جب وہ اپنے لیے حدبندیاں قائم کرنے کے شعور تک نہیں پہنچے تھے۔ بچپن اور لڑکپن کے بیچوں بیچ انہوں نے لکھے ہوئے لفظ کے حوالے سے اپنے تخلیقی ذہن کا رشتہ اپنے عہد سے جوڑنا چاہا ہو گا اور یوں جنوں خیز مطالعاتی طوفان میں بہتے ہوئے وہ اپنی دھرتی کی سرحدوں تک جا پہنچے ہوں گے، جہاں دوسرے انسانی گروہوں کے تجربات لفظوں کے روپ میں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب دارالاشاعت ماسکو کے تراجم اور مقامی تاریخی و رومانی ناول ہی وہ بڑی پناہ گاہیں تھیں جو ہماری نسل کو میسر تھیں۔ ان پناہ گاہوں میں دھکیل دیے جانے کی ذمہ داری بڑی حد تک خود ترقی پسند تحریک پر عائد ہوتی ہے جس نے اپنی دھرتی کی طرف کم سفر کیا اور تخلیق کے ڈھلے ڈھلائے غیرملکی سانچے مسلط کرنے کی زیادہ کوشش کی۔ یہ ایک طرح کی نظری گماشتگی ہی تھی جس کا سایہ ہماری اس دور کی انقلابی تحریکوں پر بھی پڑا۔ ان حالات میں مرزا حامد بیگ کی پوری نسل کے سامنے دو

ہی راستے تھے۔ یا تو وہ ترقی پسندی کی اسی روا روی میں کھو کر رہ جائیں۔ جیسا کہ ہر دوسرے درجے کے ترقی پسند افسانہ نگار نے کیا اور یا پھر اپنے ماحول کی خود رو حرکت کے ساتھ جڑے رہیں اور تاریخ کے گھومتے ہوئے چاک کے ٹھہر جانے کا انتظار کریں۔ مرزا حامد بیگ نے یہی دوسرا راستہ اپنے لیے منتخب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دور کی ترقی پسندی کا ادراک رکھتے ہوئے بھی جس چیز نے انہیں اس سیلاب میں بہہ جانے سے روکا ہے وہ ان کا نسلی پس منظر ہے، جس میں ایک لاشعوری احساس بڑی شدت کے ساتھ ملتا ہے کہ شاید دیہی زندگی کے کیف کے ابھی کچھ دن باقی تھے کہ اسے خارج کی طاقتوں نے توڑپھوڑ کر رکھ دیا۔ اس ٹوٹ پھوٹ نے، جسے مانوسیت کے چنگل میں گرفتار ذہن نے کبھی قبول نہیں کیا، ایک ایسی نفسیاتی جارحیت کو جنم دیا ہے جو مرزا حامد بیگ کے تخلیقی سفر میں ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور نجانے کہاں تک ساتھ چلے گی۔ یہی وہ ذہنی، خاندانی، نسلی اور جغرافیائی پس منظر ہے جسے ہم مرزا حامد بیگ کی دھرتی کہہ سکتے ہیں۔ جس میں گڑے ہوئے قدم (جنہیں اصطلاحاً" مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں ابھارا گیا لڑکپن کہا جائے گا) مرزا حامد بیگ کے افسانے کی پہچان بنے۔

میں نے ابھی ابھی جس دیہی یا نسلی پہچان کی بات کی ہے وہ اس دھرتی کے دامن پر جگہ جگہ بکھرے ہوئے سماجی دھارے ہیں جن کا غیر منقسم ہندوستان میں ورود تاریخ کی اپنی الٹ پلٹ کے نتیجے میں ہوا ہے۔ یہ سارے جارحانہ سماجی دھارے جو اب خوابیدگی کا شکار ہو چکے ہیں، ان خوبصورت پرندوں کی مانند ہیں جو چپ سادھے اپنے انڈوں پر بیٹھے ہیں لیکن جب کبھی کوئی ان کے گھونسلوں میں مداخلت کرتا ہے تو وہ اسے اپنی ننھی ننھی چونچوں سے لہولہان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں کے سماج میں جارحیت نہیں تھی وگرنہ ان نسلی گروہوں کا لہو سارے ہندوستان کی رگوں میں دوڑ رہا ہوتا اور یہ روسے پیدا ہی نہ ہوتے جو اب اپنی شناخت کے عمل میں دربدری سے دوچار ہیں۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی بھی معاشرہ محض جارحیت کے بل بوتے پر اپنے پھیلاؤ کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یقیناً ہندوستان نے بھی تاریخ

کے الٹ سفر نہیں کیا۔ وہ تمام انسانی گروہوں کے رو سے، جن کی نمائندگی قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور مرزا حامد بیگ جیسے تخلیق کار کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ایک ہمہ گیر معاشرے کے حق میں دستبردار ہو جائیں اور اس معاشرے کی سماجی صلاحیت کے نکاس اور زندگی پر اس کی بالادستی کے عمل کا حصہ بن جائیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری دانست میں مرزا حامد بیگ کے فن کا سفر اسی جانب گامزن ہے۔

مرزا حامد بیگ کے افسانے کی یہی وہ جہت ہے جس کا تعین کرنا میرے لیے ممکن تھا۔ ان کے افسانوں کی دوسری بڑی خصوصیت ان کا "خود رو اپنا پن" ہے۔ یعنی انہوں نے افسانے میں باہر کے کسی تاثر یا پہلے سے طے شدہ رو سے کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا اور یوں سارا ارتقاء ان کی اپنی داخلی کیفیات کے فروغ کے نتیجے میں ہوا۔

مرزا حامد بیگ ہمارے عہد کے ایک صاحب طرز افسانہ نگار ہیں۔ ساخت و بافت کے اعتبار سے ان کے افسانہ پر کسی اور کا رنگ دکھائی نہیں دیتا البتہ نظری سطح پر وہ فرانسیسی زوال پسندوں کے بہت قریب ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> "پیش منظر کا افسانہ OBSCURE ہے۔ میں کہوں گا اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ پیش منظر کی نفسی کیفیت دھندلی ہے اور شدید غیریقینی۔ میں فرانسیسی زوال پذیروں کے ہیرو وی اسنتی (تخلیق کار کا نام HUYSMAN) کے ڈرائنگ روم سے متاثر ہوں اور میرے ساتھ اس ڈرائنگ روم میں انتظار حسین کے "لمبا قصہ" اور سریندر پرکاش کے "رونے کی آواز" کے کردار ہیں اور ہمارے سامنے بلراج منرا کا "انٹرو ورٹ" خودکشی کر گیا ہے"
>
> (افسانے کا منظرنامہ ۔ ص ۱۵۱)

اس قربت کی غیرمرئی طور پر ایک جیسی تاریخی وجوہات بھی ہیں۔ فرانسیسی جارحیت پسندی اور ہندوستان کے نسلی گروہوں میں فروغ پذیر ہونے والی جارح سائیکی میں جو تاریخی یگانگت پائی

جاتی ہے شاید اسی نے مرزا حامد بیگ کو فرانسیسی زوال پسندوں کے قریب کیا ہے۔

اب اگر ہم فرانس کے تاریخی پس منظر پر نظر دوڑائیں' تو ہمیں ایک بہت بڑی حقیقت کا ادراک ہو گا کہ یورپ کی سیاسی قوتوں کی دھینگا مشتی میں فرانس نے کبھی بھی اپنے حجم کے مطابق کردار ادا نہیں کیا اور نہ اس میں وہ سماجی ہمہ گیریت پیدا ہوئی جو ہم یونان' اطالیہ' جرمنی یا برطانیہ میں دیکھتے ہیں۔ اس طرح فرانس شعوری اور غیرشعوری طور پر ہمیشہ اپنی شناخت اور تشخص کی بقا کے مسئلے سے دوچار رہا ہے۔ یہ وہ حالت زار ہے جو یا تو تنگ نظر قوم پرستانہ رو سے پیدا کرتی ہے اور یا پھر انتہا پسند سماجی ہیجانات۔ ہمیں فرانس کی سماجی سطح پر یہ ہیجان کہیں کہیں بڑا نمایاں نظر آتا ہے۔ فرانس جو یورپی سیاست میں برطانوی استعمار کے مقابلے میں ہمیشہ آزادی اور انصاف کا خودساختہ ترجمان رہا ہے۔ لیکن اسے جب بھی اور جہاں کہیں بھی موقع ملا اس نے کچلی ہوئی اقوام کی حریت پسندی کو ظالمانہ طریق پر مزید کچلنے کی کوشش کی۔ فرانس' جو جمہوری حقوق کے علمبرداروں کا ملک ہے' خود اپنے عوام کو سو سال پہلے تک جمہوری حقوق نہیں دے سکا۔

جہاں عہد حاضر میں انسان کی حریت فکر کے بڑے ترجمان' فرانس کے معاشرے کی زینت تھے وہیں فرانسیسی سپاہی سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے مظلوم اور کمزور حریت پسندوں کو الجزائر کے عقوبت خانوں میں ہولناک تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ لیکن فرانس نے اپنے معاشرے کی صلاحیت سے کہیں بڑھ کر انفرادی صلاحیت کا مظاہرہ کیا' اور جس نے تخلیقی سطح پر دنیا کو بڑی شدت سے متاثر کیا۔ اس کے متاثرین میں ہندوستان کا بیدار تخلیقی ذہن بھی شامل تھا۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ ہندوستان' جس نے اپنی معاشرتی صلاحیت کے مطابق خال خال انفرادی صلاحیت پیدا کی' اپنے خارجی رویوں کی سطحوں پر فرانس سے گلے ملتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بلاشبہ فرانس کی یہ انفرادی صلاحیت اسکے داخلی ردعمل اور خارجی انسانی صلاحیت کی ہم آہنگی ہی کا نتیجہ ہے' البتہ اس کی مار فرانس سے زیادہ باہر کی دنیا کی طرف ہے۔ خود فرانسیسی معاشرے میں اسے پوری طرح

سہار لینے کی طاقت موجود نہیں اور ان رویوں کی دیگر علاقوں میں دربدری کا اصل سبب نوآبادیاتی بالادستی کی جنگ میں برطانوی استعمار سے فرانس کی شکست خوردگی ہے۔ نیز وہ غیرارادی خواہش' جو فرانس کو باہر کی دنیا میں وجود پذیر کرے۔

ہندوستان کے وہ نسلی اور محدود جغرافیائی نیز گروہی روے' جو صلاحیتوں کی خوابیدگی کا شکار ہو چکے ہیں اب نئے رویوں میں ڈھلتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو اس غیرمحسوس فرانسیسی دربدری کو اپنی باہوں میں سمیٹ لینے کا خواہاں ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کچھ مدت بعد جب یہ مرحلہ بھی انجام پذیر ہو جائے گا تو ہم اس لاش کو کہاں دفن کریں گے؟ یہ مجھے نہیں معلوم' لیکن یہ بات طے ہے کہ ہندوستان کے سماج میں جو زبردست صلاحیت ہمیشہ سے موجود رہی ہے' اسے انفرادی صلاحیت میں منتقل ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا اور یہی وجہ ہے کہ اس خلا کی طرف دوسرے نسبتاً کم صلاحیت کے حامل معاشروں کی نمایاں انفرادی صلاحیت سفر کرتی ہے۔

وہ تمام ادبی معجزات جو فرانس کی سرزمین پر رونما ہوئے ہیں' دور دراز سے آئے ہوئے بہادر سپاہیوں کی شہادت کی مانند ہیں' جن کا لہو فرانس کے چہرے پر سرخی ملتا آیا ہے۔ کیا خبر ان شہدا کی لاشوں کو ہندوستان کے گہرے وجود سے نکلی ہوئی روح' مرزا حامد بیگ کی معرفت پھر زندگی دے دے۔ اگر ایسا ممکن ہے' تو پھر یہی وہی افسانہ ہے جس کی خودرو ارتقائی صلاحیت اپنی "راہ" اور "اپنے پن" سے الگ نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ اب تک نہیں ہوا ہے مثلاً مرزا حامد بیگ کی وضع کردہ علامات کا خودرو ابھار بڑی بے ساختگی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور افسانے کے آخر تک علامت کی جبریت کا شکار نہیں ہوتا۔ جو تبدیلی وقت گزرنے سے اس افسانے میں پیدا ہوتی ہے وہ نظری اور فکری تجربہ ہے' جسے زندگی اپنی واردات کے ذریعے ایک تخلیقی ذہن کے حوالے کرتی ہے۔ یہ مرزا حامد بیگ کا کمال ہے کہ وہ اسے اس کی تمام تر و تازگی اور بے ساختگی کے ساتھ قاری تک پہنچانے پر قادر ہے۔

یہاں ہم نے کسی حد تک مرزا حامد بیگ کے تخلیقی عمل کی ابھرتی اور پھیلی ہوئی سمتوں کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سارے کا احاطہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ مرزا حامد بیگ بطورافسانہ نگار کے ایک طرف تو اپنی داخلی ترقی میں کہانی اور علاقائیت کے چنگل سے آزاد ہو رہے ہیں او دوسری طرف خارج کے جارحانہ جبر کے سامنے اپنی پوری صلاحیت اور حوصلے کے ساتھ کھڑے ہیں۔

سید شبیر شاہ

شعبہ تاریخ
گورنمنٹ زمیندارہ کالج، گجرات۔
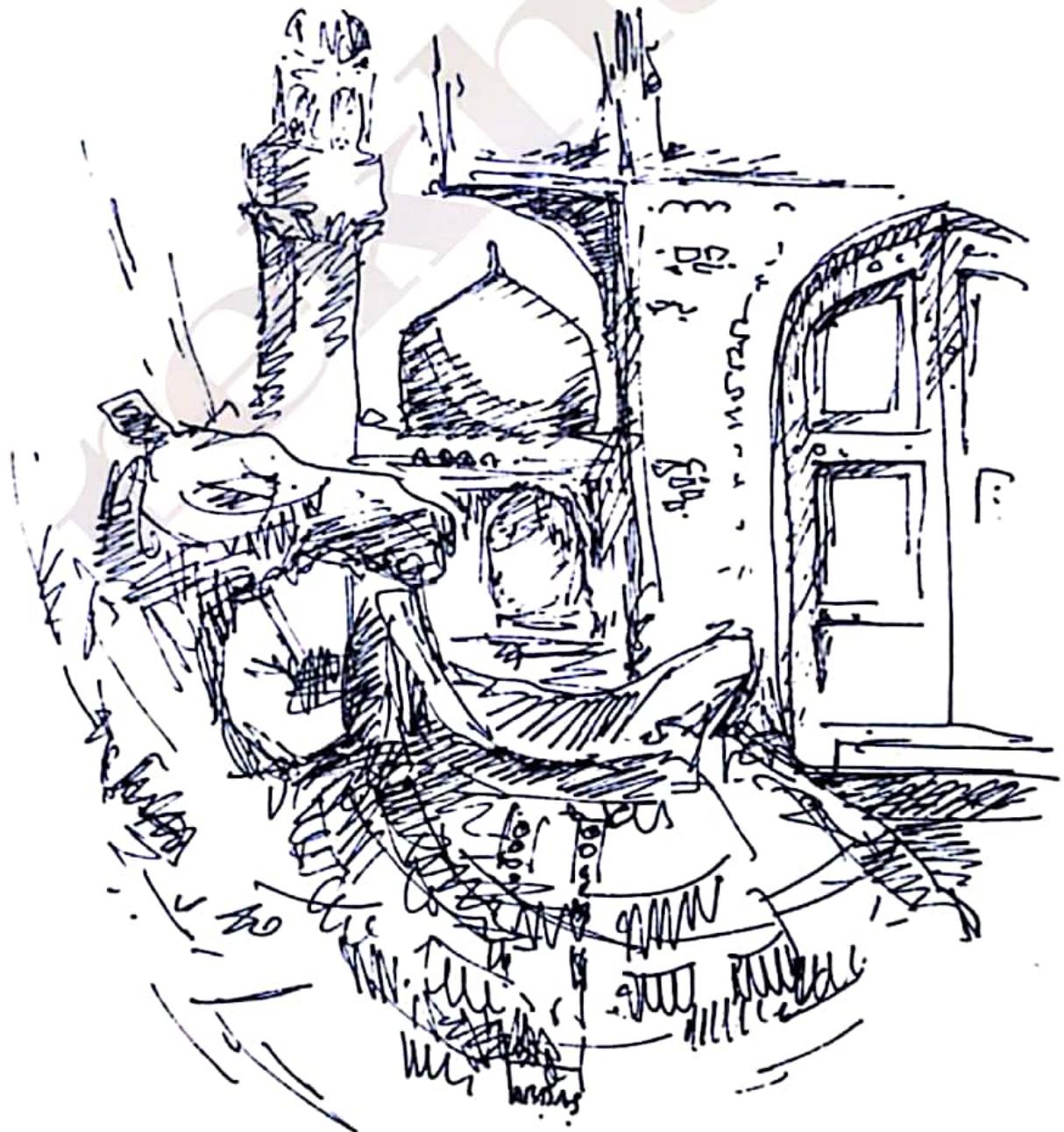
سانڈنی سوار

میں نے جو کچھ اپنے مرحوم باپ کی زبانی سنا' اسے والدہ مرحومہ کی آنکھوں سے دیکھا۔
قبلہ والد صاحب جہاں حقیقت احوال میں الجھ کر رہ جاتے' وہاں میری والدہ محترمہ لقمہ دیتیں اور چونکہ مجھے ہمیشہ سے دوسروں کی آنکھوں دیکھی کا بیان مسحور کرتا چلا آیا ہے' اس لیے کبھی اس بات سے غرض نہیں رکھی کہ کہاں میری جنتی ماں خاموش رہی اور کہاں کہاں میرے باپ نے غلط بیانی سے کام لیا۔

کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ' مجھے اس سے کچھ غرض نہیں۔ بیان دلنواز ہے اور کہانی مرغوب۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ پیرو مرشد بعد نماز مغرب اپنے مدرسے میں درس دے رہے تھے۔ مدرسہ کیا تھا' مل بیٹھنے اور سر ٹیکنے کا ایک بہانہ تھا۔ چھدرے چھپر کے نیچے قبلہ کے رخ پر ایک بھاری چٹان کو کاٹ کر منبر بنا لیا گیا تھا' جس کے عین اوپر مٹی کا ایک دیا ٹمٹاتا تھا۔ فرش پر گھاس پھونس کی تہ جمی تھی' جس پر اعلیٰ حضرت کے علاوہ کل چار نفوس تھے' جو ہمہ تن گوش تھے۔

پیرو مرشد نے منبر سے ٹیک لگا کر اپنی ایک ٹانگ کو سامنے کی سمت پھیلا رکھا تھا اور نہایت بے تکلفی سے بیان فرما رہے تھے۔ علم کا ایک دریا موجزن تھا' جس کے کناروں کی کہیں

اور چھوڑ نہ ملتی تھی۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی اور دس بارہ جوان بلااجازت اندر داخل ہوئے۔ ایک کے بعد ایک' سر جھکائے ہوئے۔ سب سے آگے اونچی دستار اور بھاری جبے میں ملبوس ایک دراز قد نوجوان تھا' جو خاموشی کے ساتھ ایک طرف ہو کر بیٹھ رہا۔ پھر باقی جوان آئے اور نہایت ادب کے ساتھ اس کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔

دئے کی مدھم روشنی میں نوواردگان کے چہرے مہروں سے انکی پہچان مشکل تھی' البتہ ان کی جوانی اس ملگجے اندھیرے سے چھلکی پڑتی تھی۔ حضرت صاحب نے اپنی ٹانگ کو سمیٹ لیا اور آلتی پالتی مار کر سیدھے ہو کر بیٹھ رہے۔ اونچی دستار والے جوان نے گردن کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ اپنے پیچھے صف بستہ ساتھیوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ جہاں جہاں کھڑے تھے' وہیں دو زانوں ہو گئے۔

اعلیٰ حضرت نے شاید یہ سوچ کر کہ ایک دوسرا عالم ان کا بیان سن رہا ہے' نہایت محتاط انداز سے اپنی گفتگو جاری رکھی اور زیر بحث مسئلے کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے گھڑی کی گھڑی درس روکا اور دستار والے جوان کی طرف متوجہ ہوئے:

"خوش آمدید۔۔۔ آپ نے اپنی آمد اور مسلک سے مطلع نہیں فرمایا' نہ تو اپنا تعارف کروایا اور نہ ہی آمد کا سبب بتایا۔"

اونچی دستار والے نوجوان نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے ہکلا کر کہا:

"جی' بس ویسے ہی آگیا تھا۔ آپ کا دیدار کرنے۔"

اعلیٰ حضرت نے دریافت فرمایا:

"اور آپ کا نام؟"

"جی' مجھے جوسف کہتے ہیں۔"

حضرت صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "جوسف۔ جوسف کیا؟" وہ زیرلب بڑبڑائے پھر دیوار سے ٹیک لگاتے اور اپنی ٹانگ کو دوبارہ سامنے کی سمت پھیلاتے ہوئے طالب العلموں سے

فرمایا:

"اس کی اونچی دستار اور بھاری جبے پر نہ جاؤ' یہ تو جوسف ہے۔"

کہنے والے نے کہا ہے کہ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نماز عشاء تک مسائل کا بیان فرماتے رہے اور ان جوانوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نماز کے فوراً بعد اعلیٰ حضرت نے سب کو اٹھ جانے کی اجازت دے دی۔

میں ہمہ تن گوش تھا کہ میرے والد بزرگ نے کھل کر قہقہہ لگایا اور فرمایا:

"بیٹا' اس کا نام یوسف تھا۔ جاہل' ایک عالم کی محفل میں آگیا تھا۔ اس نے علماء کے لباس کی توہین کی۔ بیٹے جبہ اور قبہ صرف عالموں کو سجتا ہے۔"

میں سنتا رہا اور اپنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔ اس وقت مجھے جوسف پر ترس آ رہا تھا اور میرے والد بزرگ اسے برا بھلا کہتے ہوئے تادیر تمباکو پیتے رہے تھے۔ پھر یکلخت میرے باپ نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

"دوسری بار پیرو مرشد سے اس کا سامنا ہوا تو اعلیٰ حضرت جنگل میں اپنی گھوڑی کے لیے گھاس کاٹ رہے تھے۔ تف ہے اس دنیا کے نظام پر' کہ اپنے وقت کا جید عام اپنے مبارک ہاتھوں سے گھاس چھیل رہا ہے اور وہ' جن کے سروں میں بھس' بھرا ہے' حکومت کر رہے ہیں۔ حیف صد حیف۔۔۔۔

ایسے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اس نے چہرے پر نقاب باندھ رکھا تھا اور اس کے لباس پر گرد جمی تھی۔ وہ گھوڑے سے اترا اور بغیر سلام دعا کے اور ادب آداب کا لحاظ کیے' کہنے لگا:

"میرے گھوڑے کی زین کے ساتھ ایک گائے کی کھال لٹک رہی ہے' جس میں ایک لاکھ درہم ہیں۔ اس کے بوجھ تلے میرا گھوڑا دوہرا ہو چلا ہے اور مجھے اس کی حاجت نہیں۔ تم مجھ سے اپنا بوجھ بدل لو۔ یہ گھاس کا گٹھا مجھے دے دو اور یہ ایک لاکھ درہم تم لے لو۔"

جانتے ہو پیرو مرشد نے جواب میں کیا فرمایا؟ اعلیٰ حضرت نے حقارت سے کہا:

"تو کردستان سے آیا ہے۔ تیری کمر سے ہندی تلوار بندھی ہے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تجھے نہیں جانتا۔ میں جانتا اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ چلا جا۔ تجھے تو بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں۔"

یہ سن کر گھڑ سوار نے اپنے چہرے پر سے نقاب اتار پھینکا، ماتھے کا پسینہ پونچھا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔ اعلیٰ حضرت کے قربان جایئے، آپ نے اسے خوب پہچانا تھا، وہ جاہل جوسف ہی تھا، جو کچھ دیر تو اسی طرح خاموش اور گم سم کھڑا رہا، پھر گھوڑے پر بیٹھ ہوا ہو گیا۔

جب اعلیٰ حضرت گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے اپنے آستانے پر پہنچے تو پتا چلا کہ وہ ادھر آیا تھا اور گائے کی کھال، جس میں پورے ایک لاکھ درہم بھرے تھے، ان کی چوکھٹ پر پھینک گیا ہے۔

کسی نے مشورہ دیا کہ لوٹ مار کے مال کو پاک کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اعلیٰ حضرت کے قائم کردہ مدرسے پر لگا دیا جائے تاکہ علم کی روشنی پھیلے اور جہالت مٹ جائے۔ سو یہی کچھ ہوا۔"

قبلہ والد صاحب یہ فرما کر خاموش ہو گئے۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسہ عالیہ تو قائم ہو گیا لیکن مفلوک الحال طالب العلموں کی حالت زبوں ہی رہی۔

زمانے بیت گئے۔

اب عالی حضرت بہت ضعیف ہو گئے تھے اور اپنے حجرے سے باہر بہت کم نکلتے تھے۔ ایک روز مدرسے کے صدر دروازے پر ایک سانڈنی سوار آ کر رکا، جو منزلیں مارتا ہوا آیا تھا اور اعلیٰ حضرت سے ملاقات کا خواہاں تھا۔

اور یہ کام کچھ اتنا آسان نہ تھا۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ وہ دراز قد سانڈنی سوار کبھی لاکھوں میں ایک رہا ہو گا' لیکن اس وقت اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور سر کے بال باہم جڑ کر ایک ہو گئے تھے۔

سانڈنی سوار کون تھا اور کہاں سے آیا تھا' اس کی کسی کو خبر نہ تھی پر وہ جس کی سمت نظر بھر کر دیکھتا' اس کی کایا پلٹ کر رکھ دیتا۔ طبیعتوں کو دنیاوی آفات اور دلوں کو مکروہ خواہشات سے آزاد کر دیتا۔

مدرسے کے طالب العلموں کو اس سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ قرب و جوار کی آبادی اسے دیکھنے کی خواہش میں ہلکان ہو رہی تھی اور وہ خود اعلیٰ حضرت سے ملاقات کی خواہش میں' بغیر کھائے پیئے وہاں تین دن اور تین راتیں رکا۔

مدرسے کی انتظامیہ کے بہت سمجھانے بجھانے اور دھتکارنے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اعلیٰ حضرت اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور سانڈنی سوار کو مدرسے کے صحن میں بلا کر صدر دروازہ مقفل کروا دیا۔

جب اعلیٰ حضرت نے سانڈنی سوار کو اور سانڈنی سوار نے اعلیٰ حضرت کو روبرو پایا تو دونوں دیر تک ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے رہے اور چپ چاپ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ باہر صدر دروازے پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے تھے اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

آخر کار اعلیٰ حضرت نے سانڈنی سوار کی بے باک نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے فرمایا:

"جاؤ بھائی اپنا کام کرو' یہاں طالب العلم بستے ہیں۔"

اعلیٰ حضرت نے صرف اتنا کہا اور اپنے حجرے کی طرف نکل گئے۔

سانڈنی سوار نے نظر بھر کر مدرسے کے صحن میں مفلوک الحال زرد رو طالب العلموں کو درس میں منہمک دیکھا اور نہایت درجہ دھیمی آواز میں بولا:

"میں تو چلا۔۔۔ تم اپنی فکر کرو۔"

اتنا کہہ کر وہ صدر دروازے کی چوکھٹ پر گرا اور دم دے گیا۔

کہنے والے نے کہا کہ وہ سانڈنی سوار جوسف ہی تھا جو پہلے بار طالب العلم بن کر آیا تھا‘ جب اسے دھتکار دیا گیا۔ پھر وہ ڈاکو لٹیرا بن گیا اور جب آخری بار آیا تو موت بھی اس کے اختیار میں تھی۔

اعلیٰ حضرت اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے اور مدرسے کے وسیع و عریض صحن میں صدر دروازے کے قریب سانڈنی سوار پڑا تھا۔ درس کے اختتام تک اس کی موت کا کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ عصر کے قریب چند طالب العلم اس طرف آئے اور اسے وہاں سے اٹھایا۔ ایک طالب العلم نے ڈرتے ڈرتے صرف اتنا کہا:

"بھائیو------ یہ تو اعلیٰ حضرت سے بھی بازی لے گیا۔"

میری جنتی ماں بھی اسی نتیجہ پر پہنچی تھی البتہ والد بزرگ نے ہمیشہ اس سے اختلاف کیا۔ ان کے خیال میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسے جیتے جی گائے کی کھال میں سی کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا تاوقتیکہ اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھتیں۔ مدرسہ عالیہ کا صدر دروازہ کہاں اور وہ لعین کہاں۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسے کا صدر دروازہ اس وقت تک نہ کھولا گیا‘ جب تک کہ سانڈنی سوار کو نہایت عجلت میں وہیں دفن نہ کر دیا گیا۔

قرب و جوار کی آبادی بہت دنوں تک گومگو کے عالم میں رہی۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا‘ کچھ پتا نہ چل سکا۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسے کے صدر دروازے پر ایک مریل سانڈنی اب بھی اپنے سوار کا انتظار کر رہی ہے۔
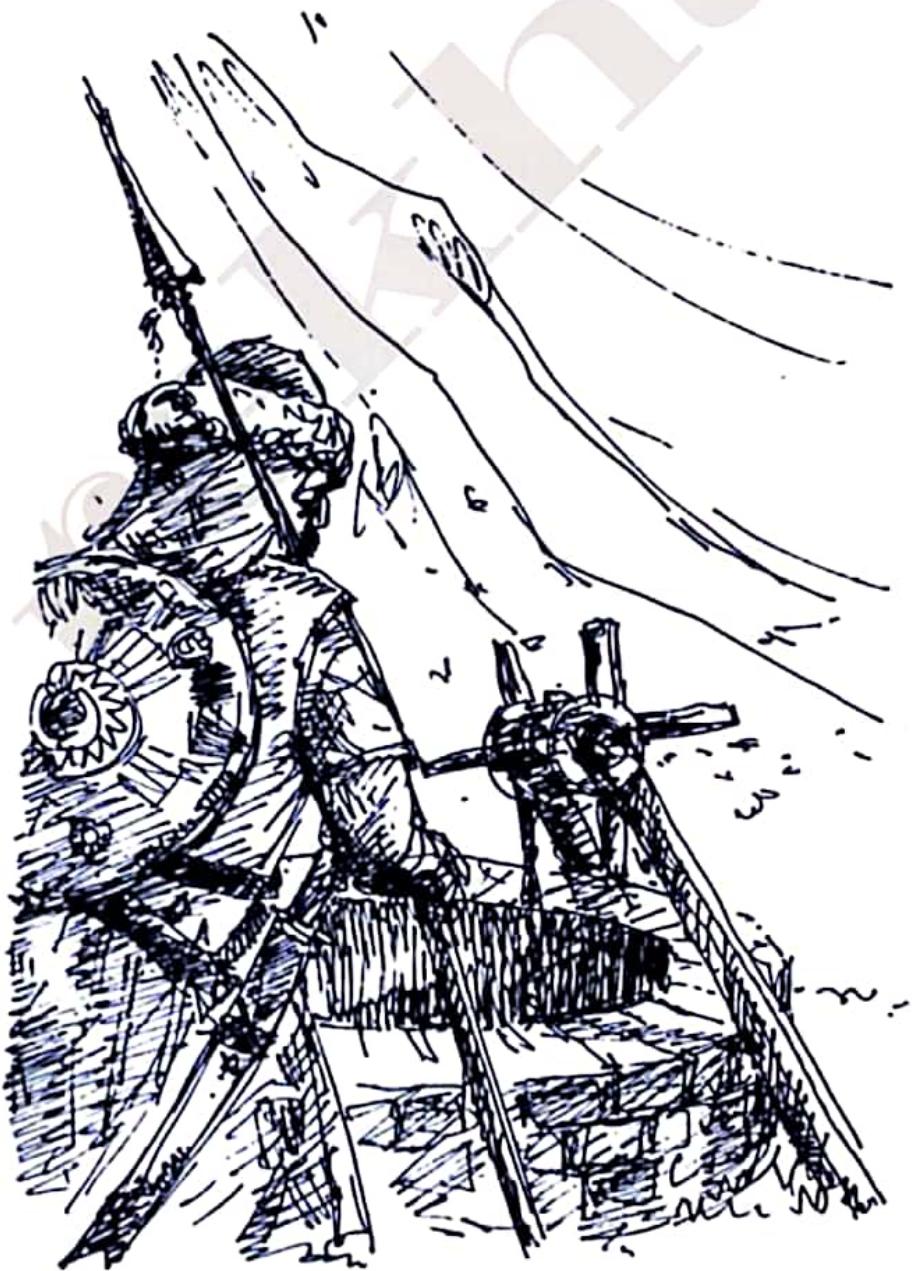
گزر ہی جاتا ہے۔

لیکن داستان گو یاد کرتا ہے' اور موسم سرما کی طویل راتوں کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک بار اس معمول سے ہٹ کر بھی ہوا۔

جب دھند تھی کہ کسی طور چھٹنے میں نہیں آتی تھی۔ رات اور دن ایک ہو گئے تھے' ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ سنگ سیاہ کی اس جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی گزرگاہ کے دونوں اطراف میں پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے کی ان گھاٹیوں میں سے غصیل سرد ہوئیں تیروں کی طرح سنسناتی ہوئی گزری تھیں۔

ایسے میں کون تھا جو ادھر کا رخ کرتا۔

دونوں اطراف سے چلے ہوئے قافلے جہاں تھے وہیں کے ہو کر رہ گئے' اور یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا۔

داستان گو اس بات پر حیران تھا اور کف افسوس ملتا تھا کہ ہر دو اطراف میں رکے ہوئے قافلے کے لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی آخر کیوں نہیں خیال کیا کہ ان گھاٹیوں کے بیچ' پتھریلی گزرگاہ کے اس موڑ پر ایک ذی نفس جینے کا جتن کر رہا ہے۔ اس کی کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تنہا تھا۔

اس کے چاروں اطراف میں کہرے کی موٹی چادر تن گئی تھی۔ وہ غصیل سرد ہواؤں کی زد میں تھا اور اس کی جائے پناہ سے بیس قدم کے فاصلے پر نیچے ترائی میں میٹھے پانی کا ذخیرہ پتھر ہو گیا تھا۔

داستان گو کہتا ہے کہ وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے پیروں کے گرداگرد لپٹی ہوئی مونج کی رسیاں خون کی سرد پڑتی ہوئی شریانوں کے ساتھ باہم ایک ہو گئی تھیں اور اس کے قریب بکھرے ہوئے اوزار زمین میں جڑیں کر گئے تھے۔۔۔۔ اور یہ کہ ایسا کچھ کئی دن اور کئی راتوں تک رہا۔

سنگ سیاہ کی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی گزرگاہ کے اس موڑ پر قافلے قیام نہیں کرتے، چپ چاپ گزر جاتے ہیں۔ لدے پھندے خچروں اور گھوڑوں کے ساتھ چلتے ہوئے مسافر اک ذرا تجسس کے ساتھ ادھر نگاہ ضرور کرتے ہیں، پر چلتے رہتے ہیں۔

داستان گو کہتا ہے کہ کبھی، گئے وقتوں میں یہاں مختصر قیام کے بغیر کوئی قافلہ آگے نہیں بڑھا، لیکن اب تھکے ہوئے قدم یہاں سے گزرتے وقت تیزی سے اٹھتے ہیں اور اگر قیام کرنا مقصود ہو تو ذرا فاصلے پر نشیب میں جا کر دم لیتے ہیں۔

داستان گو بیتے ہوئے زمانوں کو یاد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ خوشگوار موسم میں، جب آسمان صاف ہوتا تو رات ہو یا دن یہاں آگ کا الاؤ ہر دم دہکتا ہی رہتا تھا اور اس پر جھکی ہوئی ایک بوڑھی گردن بس جھکی ہی رہتی تھی۔ لوہا کوٹنے کی آواز اس گھاٹی میں دور دور تک گونجتی رہتی اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں میٹھے پانی کے ذخیرے پر سود و زیاں کے جھگڑے نپٹنے میں نہیں آتے تھے۔

اس دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے کی ان گھاٹیوں میں موسموں کی کوئی تخصیص نہیں رہی۔ رات کی رات کو سیٹیاں بجاتی ہوئی تیز سرد ہوائیں چلتی ہیں اور دوپہر دن تک دھند چھٹ جاتی ہے، سردی کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ نشیبی علاقوں کی طرح یہاں بھی موسم سرا سج سج

گزر ہی جاتا ہے۔

لیکن داستان گو یاد کرتا ہے' اور موسم سرما کی طویل راتوں کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک بار اس معمول سے ہٹ کر بھی ہوا۔

جب دھند تھی کہ کسی طور چھٹنے میں نہیں آتی تھی۔ رات اور دن ایک ہو گئے تھے' ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ سنگ سیاہ کی اس جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی گزرگاہ کے دونوں اطراف میں پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے کی ان گھاٹیوں میں سے غصیل سرد ہوائیں تیروں کی طرح سنسناتی ہوئی گزری تھیں۔

ایسے میں کون تھا جو ادھر کا رخ کرتا۔

دونوں اطراف سے چلے ہوئے قافلے جہاں تھے وہیں کے ہو کر رہ گئے' اور یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا۔

داستان گو اس بات پر حیران تھا اور کف افسوس ملتا تھا کہ ہر دو اطراف میں رکے ہوئے قافلے کے لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی آخر کیوں نہیں خیال کیا کہ ان گھاٹیوں کے بیچ' پتھریلی گزرگاہ کے اس موڑ پر ایک ذی نفس جینے کا جتن کر رہا ہے۔ اس کی کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تنہا تھا۔

اس کے چاروں اطراف میں کہرے کی موٹی چادر تن گئی تھی۔ وہ غصیل سرد ہواؤں کی زد میں تھا اور اس کی جائے پناہ سے بیس قدم کے فاصلے پر نیچے ترائی میں میٹھے پانی کا ذخیرہ پتھر ہو گیا تھا۔

داستان گو کہتا ہے کہ وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے پیروں کے گرداگرد لپٹی ہوئی مونج کی رسیاں خون کی سرد پڑتی ہوئی شریانوں کے ساتھ باہم ایک ہو گئی تھیں اور اس کے قریب بکھرے ہوئے اوزار زمین میں جڑیں کر گئے تھے۔۔۔۔ اور یہ کہ ایسا کچھ کئی دن اور کئی راتوں تک رہا۔

اس مدت میں دونوں اطراف کے قافلے موسم صاف ہو جانے کے انتظار میں' جہاں تھے وہیں رکے رہے۔ پانی کا ذخیرہ پتھر ہی رہا' اور مونج کی رسیاں خون کی سرد شریانوں کے ساتھ باہم ایک ہو گئیں۔

داستان گو نے بتایا کہ جب موسم کا زور ٹوٹا تو رات کا پہلا پہر تھا جب ایک تجارتی قافلہ سب سے پہلے وہاں پہنچا' اور اس کے بعد پسینے میں شرابور ایک گھڑ سوار وراد ہوا۔

گھڑسوار کی وہاں آمد سے کچھ ہی دیر پہلے آنے والے قافلے کے مسافر پہلے تو ایک جمگھٹ کی صورت میں اس یخ بستہ بوڑھے وجود پر جھکے رہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے الاؤ روشن ہوا' بکھرے ہوئے اوزاروں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا گیا' اور اس کی جان بچانے کے لیے بڑی بھاگ دوڑ ہوئی۔ شاید یہی وجہ ہو کہ قافلے کے بروقت وہاں پہنچ جانے اور پڑاؤ کرنے سے اس کے سانس کی ڈور ٹوٹی نہیں۔

داستان گو کہتا ہے کہ جب گھڑ سوار وہاں پہنچا تھا تو اس یخ بستہ وجود میں زندگی کے آثار جاگ رہے تھے۔

نووارد گھڑ سوار نے سب سے پہلے اپنی شناخت کروائی' اور اس کے بعد اپنے چوغے کے اندرونی جیب سے ایک لپٹا لپٹایا چرمی حکم نامہ نکال کر سب کو دکھایا۔ پھر وہ بھی اس یخ بستہ بوڑھے وجود پر جھک گیا۔ اس نے اس یخ بستہ ہڈیوں کے ڈھانچ کو پہچاننے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

اسے سخت مخمصے کا سامنا تھا' اور شاید وہ اسی تندی میں آگے بڑھ جاتا کہ وہاں پر موجود سرخ جٹاؤں والا ایک بوڑھا بیوپاری کچھ یوں گویا ہوا:

"سرکار کا اقبال بلند رہے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں---- اور یہ کئی برس پہلے کی بات ہے کہ یہ میرا ہم سن' خمیدہ کمر بڈھا اس سنگ سیاہ کی بل کھاتی ہوئی گزرگاہ پر منزلیں مارتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ جانے یہ چلا کہاں سے تھا اور اسے

کس طرف کو جانا تھا۔۔۔۔۔۔ میں تو بس یہی کچھ جانتا ہوں کہ اس کے متناسب ہاتھ پاؤں' بازوؤں کی تڑپتی ہوئی مچھلیوں' چوڑی چھاتی' فراخ پیشانی اور شہابی رنگت کی چھب آنکھوں میں نہیں سماتی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب جوانی کو اس کے ہونے پر گھمنڈ تھا۔۔۔ اس نے یہ سفر کیوں اختیار کیا تھا' یہی جانے یا رب سچا' لیکن ہوا یہ تھا کہ اس مقام تک آ کر اس کی مشکی گھوڑی یکایک ٹھوکر کھا کر گری تھی اور دم دے گئی تھی۔ اس نے جگر جگر کرتی ہوئی زین کو خود اپنے ہاتھوں سے کھول کر گھوڑی سے علیحدہ کیا اور دیر تک گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا۔۔۔ پھر اس نے اس ترائی میں اتر کر پانی پیا اور خدا کا شکر بجا لایا۔۔۔ برسوں پہلے جب میرا یہاں سے پہلی بار گزر ہوا تھا تو یہ سب کچھ اس نے مجھے خود بتایا۔ اس وقت میں بھی جوان تھا اور لاکھوں میں ایک تھا' لیکن کیا عرض کروں۔۔۔۔۔۔ خود جوانی کو اس کے ہونے پر گھمنڈ تھا۔ اس نے آگے جانے یا واپس لوٹ جانے کا ارادہ کیوں ترک کیا؟ یہ اس کا خدا جانے' پر میرے خیال میں اس کی کوئی خاص وجہ ضرور رہی ہو گی۔۔۔۔۔ کتنے موسم آئے اور بیت گئے تاوقتیکہ جوانی کا گھمنڈ ٹوٹا۔ تب سے یہ خمیدہ کمر' یہاں پڑاؤ کرنے والے قافلوں کی ڈھارس بنا ہے۔ ہمارے گھوڑوں اور خچروں کے ٹوٹے اور گھسے ہوئے نعل اس نے اپنے ہاتھوں سے بدلے' زین کا اسباب مرمت کیا' اور اس کے سوا مسافروں کی خاطر اس سے جو کچھ بن پڑا کیا۔۔۔۔۔ ترائی میں میٹھے پانی کا ذخیرہ ہے۔۔۔ ذرا جھکیے تو۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اس تک پہنچنے کے لیے اب کھڑی ترائی نہیں اترنا پڑتی۔ اب تو اوپر ایک چرخی گھومتی ہے اور اس کے ساتھ چکتا ہوا ڈول' جو پلک جھپکتے شہد سے بڑھ کر میٹھا پانی اوپر کھینچ لاتا ہے۔۔۔۔ معاف کیجیے گا' اس وقت گھومنے والی چرخی اور ڈول دکھائی نہیں دے رہے۔ یہ دودھیا دھواں اور ملگجا اندھیرا صبح تک چھٹ جائے گا تو خود ملاحظہ کر لیجیے گا۔۔۔۔"

داستان گو کا بیان ہے کہ اس سرخ جٹاؤں والے بڈھے کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ نووارد گھڑسوار نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کر دیا اور بولا:

"تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں جس مقصد کے تحت یہاں آیا ہوں' اس لعین کو بہت پہلے اسی کام کی خاطر بھیجا گیا تھا۔"

اس نے یہ کہا اور اپنی کمر سے لٹکتے ہوئے خنجر کو ایک جھٹکے کے ساتھ کھولا' فضا میں لہرایا اور پلک جھپکتے میں اس یخ بستہ بوڑھے وجود میں اتار دیا۔

اس کے بعد وہ وہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔ اس نے گھڑی دو گھڑی میں مرنے والے کی سزا کا حکم نامہ پڑھ کر سنایا' جھک کر موت کی تصدیق کی اور ترائی میں میٹھے پانی کے ذخیرے کی طرف نکل گیا۔

وہ بہت جلدی میں تھا' اس نے صبح کا انتظار بھی نہیں کیا اور پسینے میں تر جدھر سے آیا تھا ادھر مڑ گیا۔

داستان گو کہتا ہے کہ وہاں رات کی رات کو ٹھہرنے والے قافلے کا کوئی ایک فرد بھی بچ کر نہیں گیا۔ سب ایڑیاں رگڑتے اور خون تھوکتے ہوئے بیت گئے۔

جانے والا' میٹھے پانی کے ذخیرے میں اس چرمی حکم نامے کے ساتھ انتہائی سریع التاثیر زہر انڈیل گیا تھا۔

انتظار گاہ

میں جہاں ہوں، اس آبادی کی بیشتر بڑی بوڑھیوں کا معمول ہے کہ سرشام چادروں اور سفید برقعوں میں لپٹی لپٹائی اپنے گھروں سے نکلتی ہیں اور گرتی پڑتی مشرق کی جانب گھڑی ترائی میں اتر جانے والی ڈھکی تک آکر پہروں چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں۔ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں پر دونوں ہتھیلیوں کے سائبان لیے نیچے ترائی میں جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ پوچھو تو بتاتی نہیں، اور یوں ہی پہروں منتظر بیٹھ کر واپس ہو لیتی ہیں۔

نیچے ترائی میں آبادی سے کوس بھر کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے پتھریلے میدان کو سرخ اینٹوں کی چنی ہوئی قد آدم دیوار نے چاروں اطراف سے گھیر رکھا ہے اور بس۔ اس تنگی حصار کا آبادی کے رخ پر ایک ہی بڑا دروازہ ہے جو ہر دم کھلا رہتا ہے اور اس چہاردیواری میں سے باہر نکلتے میں نے کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔

ایک زمانہ تھا جب اس چہار دیواری کے اندرونی معاملات کی نگہداشت اور آبادی کے رخ پر اس میں جڑے ہوئے آہنی دروازے کو کھولنے اور بھیڑنے کی خاطر کئی افراد پر مشتمل باقاعدہ ایک عملہ مامور تھا۔

اس تنگی حصار میں قید جنگلی سوروں کا ایک ریوڑ تھا، جسے کسی پل چین نہ تھا۔ وہ کھروں سے پتھریلے میدان کو ادھیڑتے نہ تھکتے تھے۔ البتہ اپنے مدمقابل کے انتظار میں گھلتے ہوئے سوروں

کے ریوڑ کی بے چینی نے ساری بستی کا سکون لوٹ رکھا تھا۔ اس بھری پری آبادی میں کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا جسے مقابلے کے دن اور تاریخ کا علم ہوتا۔

اس پتھریلی چہاردیواری پر مامور عملے کا جب کوئی رکن اپنے خچر پر خالی بورا سنبھالے بستی سے سودا سلف سمیٹنے کی خاطر آبادی کا رخ کرتا تو اسے مشرقی ڈھکی چڑھتے ہی بچے گھیر لیتے اور مقابلے کا دن اور تاریخ دریافت کرتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چوگرد لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ جم جاتا' یہاں تک کہ خچر سوار کو اپنے چاروں اطراف میں چابک لہرا لہرا کر بازار میں سے گزرنے کا راستہ بنانا پڑتا۔ وہ ہر سوال کے جواب میں چپ رہتا اور اپنے کام سے غرض رکھتا۔

یہ کیفیت اس وقت تک رہتی جب تک کہ وہ بازار میں گھوم پھر کر اپنے لدے پھندے خچر کی باگیں تھامے ڈھکی نہ اتر جاتا۔ شاید سوروں کے ریوڑ کی نگہداشت پر مامور عملے کے فرائض منصبی میں چپ رہنا بھی شامل تھا۔ سو وہ آتے' بے چین ہجوم کے سوالات کے جواب میں خاموشی کے ساتھ سودا سلف سمیٹتے' چابک لہراتے لدے پھندے خچر کے آگے جما کر قدم رکھتے ترائی میں اتر جاتے۔

عجیب بات تھی کہ جس دن خچر سوار آبادی کی طرف پھیرا لگاتا اس کے اگلے روز آبادی میں سے پانچ جوان لاپتا ہو جاتے۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ مقابلے کے مخصوص دن سے پہلے کسی ذی نفس کو اس سنگی حصار کا رخ کرنے کی اجازت نہیں تھی' اور اس مخصوص دن کا پوری آبادی میں کسی کو علم نہیں تھا۔

ان کی ڈھکی چڑھنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا اس لیے آبادی کے لوگ لوہا کوٹنے' بان کی لچھیاں بنانے' چاک گھما کر کوزے تراشنے' کولہو میں سرسوں پیلنے اور کپڑا کاتنے والی کھڈیوں کو متحرک رکھنے میں جٹے رہتے اور بے کار اور ناکارہ بڈھے دن بھر بیٹھے تمباکو پیتے رہتے۔ لے دے کر بچے رہ جاتے تھے جو آبادی میں مکتب نہ ہونے کے سبب مشرقی ڈھکی پر منڈلاتے رہتے اور جب خالی بورا سنبھالے خچر سوار آبادی کا رخ کرتا تو اسے گھیر لیتے۔ تب "سررڑ سررڑ" ان کے

سروں پر چابک لہراتا اور وہ بچ بچ جاتے۔

یہ سب کیا تھا؟ اس راز کی حقیقت جاننے کی خاطر میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر وقت روتے اور احتجاج کرتے گزار دیا۔

میں سخت شرمسار ہوں کہ میرا بچپن اور لڑکپن اس سنگی حصار کی اصل حقیقت کو جانے بغیر بیت گیا اور باقی وقت میں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے چپ رہا۔ لیکن مجھے اس بات کا فخر بھی حاصل ہے کہ اس بھری پری آبادی کے سال خوردہ افراد میں سے شاید ایک میں ہی ایسا بڈھا بچا ہوں جسے اس سنگی حصار میں اپنے کھروں سے زمین ادھیڑتے سوروں کے ریوڑ کی اصل حقیقت معلوم ہے۔ میں اس خطرے کے پیش نظر کہ آج ہوں اور کل نہیں رہوں گا' آپ کو اپنے اس راز میں شریک کر رہا ہوں۔

یہ درحقیقت ایک ایسی شام کا قصہ ہے جب میں اور میرے دو بچپن کے ساتھی فیکا اور کیما باہر کوٹ والوں کی شادی کی رونق دیکھنے کے بہانے سب کو جل دے کر چھپتے چھپاتے اس سنگی حصار کی جانب اتر گئے تھے۔ ہم نے ترائی اترنے سے پہلے اپنی چپلیں اتار چھوڑی تھیں اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے اندھیرے میں اترتے چلے گئے تھے۔

وہ غضب کی رات تھی۔ آسمان پر چھدرے بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں چاند کے چہرے کو کبھی تو پوری طرح ڈھانپ دیتیں اور کبھی دور سے سج سج اس کی طرف بڑھتے ہوئے محض اپنے دامن کو اس کی جانب لہرا کر پرے نکل جاتیں۔

پھاگن کی کیا تاریخ تھی ٹھیک طرح یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب ہم تینوں اندر کوٹ کے شہید بابا کے مزار پر اکٹھے ہوئے تھے اور ترائی اترنے کا منصوبہ بنایا تھا تو ہم تینوں کے جبڑے سردی سے کھٹ کھٹ بج رہے تھے اور ٹھیک طرح بات منہ سے نکلتی نہیں تھی۔

ترائی اتر کر اس سنگی حصار تک کوس بھر کا سفر ہم نے منٹوں میں طے کر لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' جب ہم ہوا میں پیرتے ہوئے ایک کے بعد ایک اس سرخ اینٹوں کی قد آدم

دیوار تک پہنچے تھے تو موٹی اون کی سوئٹر اور گاڑھے کے شلوار کرتوں میں ہم تینوں پسینے میں نہائے ہوئے تھے اور دل سینے میں سماتا نہیں تھا۔

باہر کوٹ والوں کی شادی پر مجرے کی محفل جمی تھی اور ہمیں جانے کیوں یہ یقین سا تھا کہ سنگی حصار پر معمور پورے کا پورا عملہ وہاں سے غیرحاضر ہے۔ یہ خیال ہمارے ذہنوں میں شاید اس لیے سمایا کہ ہمیں ترائی اترنے اور سرخ اینٹوں کی دیوار تک آتے کسی نے روکا نہ تھا۔

ہم نے اس خیال خام میں خاصی لاپروائی برتی۔ ایک موقع پر فیکے کا پیر رپٹ گیا اور وہ اوندھے منہ نیچے آ رہا۔ اس غلطی کی سنگینی کا احساس اس وقت ہوا جب سرد اندھیرے کو چیرتی ہوئی پکی بندوق کی دو گولیاں کھکے اور میرے سروں پر سے گزر گئیں۔ خیر اس میں گزری کہ اس وقت بدلیوں نے چاند کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا اور وہ پھاگن کی ایسی سرد رات تھی جس میں سنگی حصار کے کارندوں نے پڑتال کو ضروری نہ سمجھا یا شاید ایک دن ایسا ہونا ہی تھا' ورنہ آج میں یہ کج مج تحریر کیا چھوڑ کر مرتا' کھکے اور فیکے کی طرح اس راز کو سینے میں سنبھالے اپنی گور اتر جاتا۔

خیر' بندوق دغنے کے بعد دیر تک ڈیوٹی پر موجود کارندے ایک دوسرے سے باآواز بلند پوچھ گچھ کرتے رہے اور پھر چپ کی بھاری چادر تن گئی۔ ہم دیوار کی اوٹ میں دم سادھے پڑے رہے تھے۔ ایسے میں یوں محسوس ہوا جیسے کئی موسم آئے اور بیت گئے ہم میں اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔

رات کے دوسرے پہر' اس سنگی حصار کے اندر یکلخت بھگدڑ کی کیفیت پیدا ہوئی اور ہمیں گھٹی گھٹی انسانی چیخیں سنائی دیں۔ لیکن یہ سب کچھ تھوڑی دیر ہی کے لیے تھا۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے اندر کی حیوانی مخلوق کو سرکاری کارندے ہانکنے میں لگ گئے اور یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔

رات کا آخری پہر ہوگا جب میں نے ہمت کر کے کھکے اور فیکے کے سہارے اس سنگی

حصار کے اندر جھانک کر دیکھا۔

آسمان پر رواں بدلیوں سے چاند کی چھدری روشنی میں سنگی حصار پر معمور عملہ سوروں کے ریوڑ کو حصار کے دوسرے نصف میں ہانکنے کے بعد کٹے پھٹے انسانی اجسام کو ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر کھینچے لیے جا رہا تھا۔ ان بے طرح ادھڑے ہوئے لاشوں کو وہ میرے دیکھتے دیکھتے گھسیٹ لے گئے۔ اس وقت روندے جانے والوں کی پہچان مشکل تھی لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کٹے پھٹے اجسام تعداد میں پانچ تھے۔

اس وقت میں کیمے اور فیکے کے سہارے کھڑا تھا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا' لیکن میں نے جو کچھ دیکھا' اس نے میرے ہاتھ پاؤں شل کر دیے اور میں نیچے کی سمت ڈھیتا چلا گیا۔ اس وقت کیمے اور فیکے نے بغیر کوئی آواز پیدا کیے بڑی ہمت کے ساتھ مجھے نیچے اتارا۔

اگلے روز فیکا اور کیما جب میرا پتا کرنے میرے گھر آئے تو میں بخار میں بری طرح پھنک رہا تھا اور ان کے آنے سے قبل بے ہوشی کے عالم میں رات کا مشاہدہ اپنی ماں کو سنا چکا تھا۔

وہ نیک بخت فیکے اور کیمے کو اندر میرے پاس لے آئی اور ہم تینوں سے اپنی قسم دے کر یہ وعدہ لیا کہ ہم رات والی بات کسی سے نہیں کریں گے۔ شکر الحمداللہ کہ ہم تینوں نے اس کے جیتے جی اپنا وعدہ نبھایا۔ لیکن اس شرمندگی کا کیا کروں جس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ لیا۔

میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ من و عن سپرد قلم کر دیا۔ حاشا' رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اور سچ پوچھیں تو بات سے بات پیدا کرنے کی اس فقیر کو توفیق ہی نہیں ملی۔

آبادی کے رخ پر کھلنے والے اس بھاری آہنی دروازے کو کھولنے اور بھیڑنے والا عملہ

نہ رہا، خچر پر خالی بورا سنبھالے "سررڑ سررڑ" چابک لہرانے اور ڈھکی چڑھنے والے نہ رہے۔ لوہا کوٹنے اور چاک پر کوزے تراشنے والے مٹی میں مٹی ہوئے۔ اب تو سرسوں کی جگہ جانے کیا کچھ چل نکلا اور کھڈیوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانوں نے لے لی ہے۔ لیکن، کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس بچی کھچی آبادی کے آثار میرے کہے سنے کی تصدیق کرتے ہیں اور ہماری بڑی بوڑھیاں اپنی آنکھوں پر دونوں ہتھیلیوں کے سائبان لیے اپنے جگر گوشوں کی راہ تکتی ہیں؟

ہیچمداں

مرزا حامد بیگ عفی عنہ
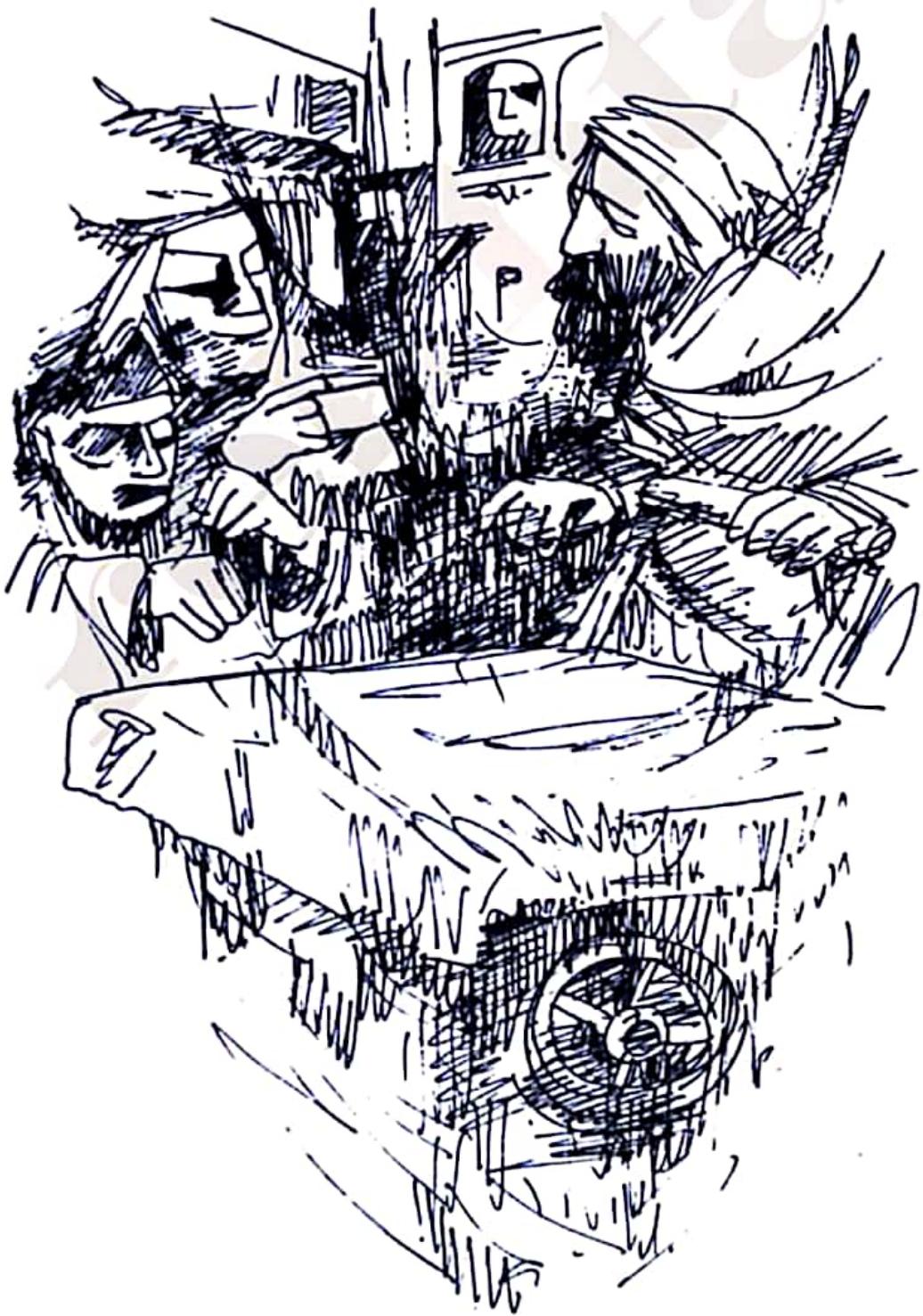
پھیری والا

بازار جملہ کاروباری اجناس سے پٹا پڑا تھا۔ سوداگر مول تول میں مصروف تھے اور بھیڑ اتنی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ایسے میں ہارون کی چہیتی بیوی زبیدہ اپنی کنیزوں کے ساتھ خریداری کرتی وہاں سے گزری تو کیا دیکھتی ہے کہ بہلول' بیچ بازار کے بیٹھا مٹی کے گھروندے بنا رہا ہے۔ زبیدہ یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوئی اور سوال کیا: "دیوانے! کہو تم نے زندگی کو کیسا پایا؟ کچھ ہمیں بھی سمجھاؤ۔"

بہلول اپنے کام میں منہمک تھا' اس نے کوئی توجہ نہ دی۔

زبیدہ نے سوال دوہرایا: "زندگی کیا ہے؟"

بہلول نے اپنے سامنے دھری مٹی کی ڈھیری کی طرف انگلی سے اشارہ کر دیا اور خاموش رہا۔

زبیدہ مسکرائی: "اور موت؟"

بہلول نے پھر اسی طرح انگلی سے مٹی کی جانب اشارہ کیا اور بولا: "کیوں بے کار وقت ضائع کرتی ہو' جب موت آئے گی تو خود جان لوگی کہ وہ کیا ہے اور زندگی کی کیا حقیقت ہے۔"

زبیدہ نے بڑے ناز سے کہا: "دیوانے! تم سے کوئی جواب نہیں بن پڑا ـــــ کہو' بھرے بازار میں اب یہ کیا کھیکھن کھیلتے ہو؟"

بہلول نے سر نیوڑھائے جواب دیا: "ملکہ! جنت کے محل بیچ رہا ہوں۔ لینا ہے تو بولو۔"

زبیدہ نے دریافت کیا: "کتنے کا بیچو گے؟"

دیوانہ اپنی سفید مونچھوں میں مسکرایا اور کہنے لگا: "تم پانچ لاکھ دینار ساتھ لائی ہو۔ ہم مول تول نہیں کرتے' اپنی چادر بچھاؤ۔"

زبیدہ نہ چادر بچھا دی اور پانچ لاکھ دینار کے عوض مٹھی بھر مٹی اٹھا لے گئی۔

اس روز رات گئے تک بہلول کو حاجت مندوں نے گھیرے رکھا اور جب دیوانہ اپنا دامن جھاڑ کر وہاں سے اٹھا ہے تو فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

داستان گو کا بیان ہے کہ ہارون الرشید نے اس رات خواب دیکھا کہ ایک بڑا محل ہے' جس کے اطراف و جوانب میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور پائیں باغ میں خوش الحان پرندوں کے ساتھ زبیدہ چہکتی پھرتی ہے' لیکن جب ہارون نے محل کے اندر جانے کی خواہش ظاہر کی تو دربان نے اسے سختی سے روک دیا۔ وہ بہت گڑگڑایا کہ دیکھو' میں خلیفتہ المسلمین' فاتح قبرص اور خاندان اغلبیہ کی مسلم سلطنت کا بانی ہوں۔ عظیم قیصر روم سے میں نے خراج وصول کیا' جملہ مسلم حکمرانوں میں ایسا کوئی ہے' جو میرے ہمسری کرے؟ لیکن دربان نے اس کی ایک نہ سنی۔

آنکھ کھلی تو وہ سخت دل گرفتہ تھا اور فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا خواب زبیدہ کو سنایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور گزشتہ روز پیش آنے والا واقعہ من و عن بیان کیا۔

داستان گو کا کہنا ہے کہ ہارون تڑپ کر اٹھا' دس لاکھ دینار باندھے اور بھیس بدل کر بازار کی طرف نکل گیا۔ دیوانے نے ابھی کچھ ہی دیر پہلے اپنی دکان سجائی تھی اور بیچ بازار کے بیٹھا' مٹی گوندھ رہا تھا۔ ہارون نے دو زانو ہو کر عرض کیا: "حضور' ایک گھر چاہیے۔ کس بھاؤ بکتا ہے؟"

بہلول نے سر جھکائے رکھا اور کہا: "تیری ساری شاہی کے عوض دے سکتا ہوں ایک

گھر' بول لے گا؟"

ہارون نے کہا: "لیکن حضور' کل تو آپ نے بہت سستا بیچ دیا۔"

دیوانہ مسکرایا اور بولا: "ہاں یہ سچ ہے' لیکن زبیدہ خاتون نے تو میرے کہے پر اعتبار کیا اور مال خریدا۔ اسے کیا خبر کہ ادھر ملے گا بھی یا نہیں۔ تم نے تو دیکھ لیا کہ اسے مل گیا۔ کہو' اسی لیے میرے پاس دوڑے آئے ہو۔۔۔۔"

ہارون لاجواب ہو گیا اور وہاں سے اٹھ آیا۔

داستان گو کہتا ہے کہ وقت اپنے آپ کو دوہراتا رہے گا۔ بہلول دیوانہ دوسری بار بھی ایک پھیری والے کے روپ میں ظاہر ہوا' لیکن ایک ایسے خطے میں' جس کی چراگاہوں میں بدیسی مویشی چرتے تھے' جس کی فضائیں غیروں نے ہتھیا لی تھیں اور جس کے پانیوں پر پرائی کشتیاں رواں تھیں۔ دیوانہ اس طرف جا نکلا' جہاں ململ بننے والی مخروطی انگلیاں ہاتھوں سے چھیل دی گئی تھیں اور زندگی کا سارا نظام بھیک میں ملنے والے قرضوں پر کھڑا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ نووارد کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ بس قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں اور لوگوں نے سرجوڑ رکھے تھے۔

وہ جس گلی محلے سے گزرتا' زندگی کا مروج نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے یوں اچانک ظاہر ہونے سے اس سرزمین کے مصروف بازاروں' صنعتی اداروں اور تجارتی مراکز پر ہمہ وقت مسلط اعصاب شکن تناؤ ماند پڑتا گیا اور ایک ہی ڈھرے پر مصروف رہنے والے جدی پشتی کچلے ہوئے کارندوں نے جیسے ایک نیا جنم لیا۔ ایک زمانہ گزر جانے کے بعد انہوں نے خود کو اور ایک دوسرے کو محسوس کیا اور یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے سنے ہوئے گراما فون ریکارڈ کو مدت بعد سنا جائے اور اس میں پوشیدہ معنویت کی پرتیں نئے سرے سے کھلیں۔

پھیری والا سر نیوڑھائے' اپنی خستہ ریڑھی پر بھربھری مٹی سجائے نکلتا۔ اس کے پیچھے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم ہوتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاروں اطراف سے لوگ اس کی جانب کھنچتے

چلے آتے۔ گلیاں اور بازار' دکانیں اور دفاتر خالی ہو جاتے' ٹریفک جام ہو جاتی اور پھیری والا آگے بڑھنے کا راستہ نہ پا کر رک جاتا اور پکارتا:

"مومنو جلدی کرو۔۔۔۔ جنت کے محل بکاؤ ہیں۔"

وہ کچھ دیر سر نیوڑھائے چپ چاپ کھڑا رہتا اور پھر اپنی چوڑی ہتھیلیوں اور مشاق انگلیوں کے ساتھ ریڑھی' پر دھری بھربھری مٹی سے گھروندے بنانا شروع کر دیتا۔ تب لوگوں کے بے طرح امڈتے ہوئے ہجوم میں مٹی کی قیمت لگنا شروع ہو جاتی اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولی لگانے والے اپنے نوٹوں سے بھرے بریف کیس ریڑھی پر الٹتے چلے جاتے۔ پھیری والا خالی بریف کیسوں میں مٹھی بھر مٹی ڈالتا جاتا اور ریڑھی پر مٹی کی جگہ نوٹوں کا ڈھیر لے لیتا۔ پھیری والے کا سارا مال منٹوں میں ختم ہو جاتا اور وہ جب نوٹوں سے لدی پھندی ریڑھی کے ساتھ اس بڑے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے نکلتا تو اس کی مشاق انگلیوں کے ساتھ اٹھتے ہوئے نوٹ کاغذی ہوائی جہازوں کی طرح چاروں اطراف میں اڑنے لگتے' حتیٰ کہ ریڑھی خالی ہو جاتی اور لوگ جھولیاں بھر لیتے۔

سب کچھ وہیں لٹا کر پھیری والا اک ذرا سر اٹھا کر اپنی نحیف آواز میں معذرت چاہتا:

"سارا مال ختم ہو گیا جی۔۔۔ زندگی رہی تو آپ کا خدمت گزار پھر حاضر خدمت ہو گا۔"

یہ سن کر ہجوم کے قدم وہیں تھم جاتے' جیسے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی ہو' اور وہ بھیڑ میں سے راستہ بناتا' تیز تیز قدم اٹھاتا سنسان گلیوں میں غائب ہو جاتا۔

پھیری والے کا یہی معمول تھا۔ وہ مٹی کا ڈھیر ساتھ لاتا' اسے سونا بناتا اور دونوں ہاتھ لٹانے کے بعد خالی ریڑھی کے ساتھ پلٹ جاتا۔

وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا' کوئی نہ جانتا تھا۔ بس قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں اور لوگوں نے سر جوڑ رکھے تھے۔

قومی اخبارات نے شہ سرخیاں جمائیں' خصوصی ضمیمے نکالے' غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

وہ کبھی ایک شہر میں ظاہر ہوتا تو کبھی دوسرے میں۔ اس کے ظہور کی تاریخ اور کوئی مقررہ پروگرام نہ تھا۔ بس وہ آتا اور بھری پری آبادیوں میں زندگی کے مروج ڈھرے کو تلپٹ کر کے نکل جاتا۔

پھیری والے کے پھیرے کے بعد فینانس کمپنیوں کے خزانچیوں اور بینک مینجروں کی جواب طلبیاں ہوتیں' سرکاری' نیم سرکاری اور نجی اداروں کے اکاؤنٹس آفیسر معطل ہوتے پر جب وہ آتا تو سب کے سب بلا سوچے سمجھے' بے اختیار ہو کر اسی کی جانب لپکتے اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا نذر کر دیتے۔ سرمایہ دار اپنے سرپیٹ کر رہ گئے' ناجائز فروش کنگال ہو گئے' بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا اور مفلس گھروں کی بیٹیوں کی ڈولیاں دھوم دھام سے اٹھنے لگیں۔ غرضیکہ کیا نہیں ہوا۔

بڑی ہاہاکار مچی' پھیری والے کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے' اس کے سر کی قیمت رکھی گئی لیکن معاملہ جوں کا توں رہا۔ سخت ترین انتظامات کے باوجود وہ اچانک ظاہر ہوتا' مٹی کی مٹھیاں بھر بھر بانٹتا' نوٹوں سے بھرے بریف کیس خالی کرواتا اور اپنی سفید مونچھوں میں مسکراتا:
"سارا مال ختم ہو گیا جی۔"

جن اخبارات میں اس کی گرفتاری سے متعلق جہازی سائز کے اعلانات شائع ہوتے' انہیں میں ایک اور مختصر سا اشتہار جانے کیسے شامل ہو جاتا:

"مومنو جلدی کرو۔۔۔۔"

یہ اشتہار کیا شائع ہوتا' اخبارات کا انتظامی عملہ مشکل میں پھنس جاتا۔ ان کی نااہلی پر بازپرس ہوتی' آرٹ ایڈیٹر اور کاتب حضرات کھڑے کھڑے معطل کر دیے جاتے لیکن وہ یک سطری اشتہار جانے کیسے چھپ ہی جاتا۔

اب رفتہ رفتہ ایک سریع اور خاموش تبدیلی کا احساس جڑ پکڑنے لگا۔ عظیم الشان دو رویہ سڑکوں پر مرکری بلب بجھ کر رہ گئے' سینما گھر' تھیٹر اور شبینہ کلب اجڑ گئے اور سمندروں میں

بدیسی مال سے لدے تجارتی بیڑے جہاں جہاں تھے وہیں رک گئے۔

یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ کارپردازان حکومت بھونچکے رہ گئے۔ ایوان بالا اور ایوان زیریں کے ہنگامی اجلاسوں میں بدیسی کارندوں اور خوشہ چینوں' نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

یہ کیسے ممکن تھا۔۔۔۔۔۔

داستان گو کا بیان ہے کہ ایسے میں ملکی سیانوں کو بدیسی گماشتوں کے ساتھ سرجوڑ کر بیٹھنا پڑا۔ ان کا مل بیٹھنا تھا کہ چند دنوں بعد اچانک ایک روز علی السحر دارالحکومت کی ایک مصروف سڑک پر پھیری والا مردہ پایا گیا۔ جب تک لوگ اکٹھے ہوتے اور شہر کا شہر امڈ تا' مستعد کارندوں نے پھیری والے کی لاش ٹھکانے لگا دی اور اس کی خستہ ریڑھی میونسپل کارپوریشن کے احاطے میں کھڑی دیگر ریڑھیوں میں شامل کر دی۔

اخبار میں اشتہار نکلا:

"مومنو' جلدی کرو۔۔۔۔"

لوگوں نے اشتہار دیکھا' اک ذرا جھرجھری لی' لیکن معمول کے کام دھندوں نے انہیں نئے سرے سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مجھے ادھر جانا تھا لیکن بروقت جا نہیں سکا۔

گدلے پانی کی نہر کے رخ پر، اس اجاڑ حویلی تک، جو میرے بچپن اور لڑکپن کی سرحد پر آباد تھی اور جسے میری جوانی سے بڑھاپے تک کے سفر نے اجاڑ کر رکھ دیا۔

وہ میرا لڑکپن تھا اور ہمارے گھر کے قریب بہنے والی گدلے پانی کی نہر کے دونوں اطراف میں دور تک پھیلے ہوئے شاداب علاقے گرمیوں کی طویل دوپہروں کی پناہ گاہ تھے۔ آموں کے گھنے باغات میری گزرگاہیں تھیں اور باغوں کے رکھوالوں کے ہاتھوں میں گھومنے والی غلیلیں اور ہریل طوطوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔

بس وہی دن تھے، جب میں نے پہلی بار بیک وقت نہر کے گدلے پانی میں تیر کر آتی ہوئی کٹی پھٹی انسانی لاشیں دیکھیں اور شام کو آبادی میں چھڑکاؤ گاڑی کے گزر جانے کے بعد ایک ایک کر کے روشن ہوتے ہوئے لیمپ پوسٹ اور سینما والوں کی بگھی کا پھیرا۔ اس کے بعد یہ سب معمول کا حصہ بن گیا۔

سارا دن اسی آوارگی میں گزر جاتا۔ رات گئے گھر کو پلٹتا تو سب گھر والے سوئے ہوئے ملتے اور نیم غنودگی کی کیفیت میں ڈوبا اردلی کھانا گرم کر دیتا۔ بس یہی میرا گھر سے رشتہ تھا۔ میں بھی کھانا کھا کر سو رہتا اور میرے گرداگرد، سوتے جاگتے، گدلے پانی میں کٹی پھٹی انسانی لاشیں

تیرتی رہتیں۔

ایک روز رات کو، والد صاحب قبلہ نے تھانیدار کی وردی اتار کر کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے فرمایا: "یہ ملعون تھے ہی اس قابل۔ ان کا کون ہے رونے والا؟ لیکن میرٹھ پولیس نے اپنی حدود سے انہیں اس طرف ہانک کر ہمیں مشکل میں ڈال دیا۔ یہ آموں کے باغات نہ ہوتے اور اتنی بہت سی سوکھی ٹہنیاں نہر تک نہ جھک آتیں تو آگے جا کر سڑتے، کتے کے پلے۔"

اگلے روز عصر کے وقت میونسپل کمیٹی کی چھڑکاؤ گاڑی گزر گئی تو ان سڑتی ہوئی لاشوں کو نہر کے گدلے پانی میں سے نکال کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔

گھڑیال والے چوک میں لیمپ پوسٹ روشن ہو گئے تو حسب معمول سینما والوں کی بگھی گزری۔ بگھی کے پیچھے کے ساتھ قد آدم فلم کے اشتہار جھول رہے تھے اور ہچکولے کھاتی نشست پر گراما فون دھرا تھا۔ سینما والوں کا مستعد کارندہ بگھی رکوا کر پہلے ساؤنڈ بکس کی سوئی بدلتا اور پھر سج سج گراما فون ریکارڈ تبدیل کرتا جاتا۔ کچھ دیر چوک میں رک کر اور گھماؤ غلیل کی طرح ٹھہری ہوئی زندگی کو نئی کروٹ دے کر بگھی آگے بڑھ گئی اور میں سڑتی ہوئی لاشوں کے ساتھ گدلے پانی میں تنہا رہ گیا۔

بس وہی دن تھے، جب کٹی پھٹی لاشوں کے ساتھ سوکھی ہوئی شاخوں کا سہارا لیے ہوئے، گراما فون کے حصول کی چینک دل میں جاگی۔

معاف کیجئے، میں شاید پھر بہک گیا۔ یاوہ گوئی کے ضمن میں ہمیشہ سے مطعون چلا آیا ہوں، لیکن بخدا، حاشیہ آرائی مقصود نہیں۔

میری مشکل یہ ہے کہ آموں کے باغات میں گدلے پانی کی نہر کے رخ پر ایک ویران حویلی بھی تھی اور جب میں نے عصر کی اذانوں کے ساتھ پہلی بار اس حویلی میں قدم رکھا تھا تو حویلی کے وسیع و عریض صحن میں ایک باوقار خاتون مٹی کے کوزے بھر بھر کے چھڑکاؤ کرنے میں مصروف تھی۔

میں حدبندی کی اوٹ میں چپ چاپ' دم سادھے' اسے اس کام میں مشغول دیکھتا رہا۔ چھڑکاؤ کے بعد اس نے صحن میں ایک ایک کر کے دو آرام کرسیاں لا کر رکھیں' بالکل آمنے سامنے۔ پھر وہ دونوں کرسیوں کو تادیر کھڑی تکتی رہی اس کے بعد وہ ایک تپائی اٹھا لائی اور تپائی پر اس نے گراما فون لا کر سجا دیا۔

گراما فون کو اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر' وہ ایک بار پھر اندر گئی اور پیتل کی اونچی سماوار اور دو پیالیاں اٹھا لائی۔ سماوار میں بھری گرم سبز چائے کی خوشبو لپٹیں لے رہی تھی۔ پھر اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے برابر کی تپائی پر رکھے گراما فون کو کھولا اس میں چابی بھری' ساؤنڈ بکس کو پھونک مار کر صاف کیا' اس کی سوئی بدلی اور دیر تک باریک تیلیوں کی پٹاری میں رکھے ریکارڈ الٹتی پلٹتی رہی۔

شام کی اذانوں تک وہ جیسے کسی کی منتظر رہی اور میں اسے چھپ کر دیکھتا رہا۔ شام کے سرمئی اندھیرے کے پوری طرح چھا جانے تک وہ تنہا بیٹھی رہی تھی اور اس کے بعد اسی ترتیب کے ساتھ اس نے صحن میں رکھی جملہ اشیاء کو ایک ایک کر کے اندر پہنچایا تھا۔

وہ کس کی آمد کی منتظر تھی۔ وہ کون تھا جس نے آنا تھا پر نہیں آیا۔ بس یہی کچھ جاننے کی خاطر میں نے اپنی کئی شامیں اس حویلی کی حدبندی میں دم سادھے' چھپ کر گزار دیں۔ لیکن آنے والے نے نہیں آنا تھا نہ آیا۔ پر وہ تھا کون' جس کا اسے انتظار تھا۔

میں نے کسی سے پوچھا نہیں۔ پوچھتا بھی تو کس سے۔ کسی کو اتنی فرصت کہاں تھی جو میرے بے معنی سوال پر توجہ دیتا۔ گھر میں کھونٹی پر ٹنگی تھانیدار کی وردی تھی اور باہر آموں کے گپ چپ باغات۔ ہریل طوطوں کے جھنڈ اور گھماؤ غلیل کی سنسناہٹ' اور یا پھر نہر کے گدلے پانی میں تیرتی ہوئی کٹی پھٹی لاشیں' چھڑکاؤ گاڑی کے مصروف کارندے اور سینما والوں کی بگھی کا پھیرا۔

بس یوں ہی گزر گئی۔

پھر ہم لوگ شہر چلے آئے اور کئی برس تک ادھر جانا ہی نہیں ہوا' لیکن گراموفون کے حصول کی خواہش دل میں ویسی کی ویسی رہی۔ کئی برس گزر گئے۔

میں کالج میں پڑھ رہا تھا جب ایک بار گھروالوں کے ساتھ' شاید کسی عزیز کی فوتیدگی پر ادھر جانا ہوا۔ پرسا دینے اور دعائے مغفرت کے بعد میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

عصر کا وقت رہا ہو گا جب میں یونہی گھومتا گھماتا اس حویلی کی طرف نکل گیا۔ حدبندی گزار کر میں نے دیکھا کہ حویلی کا وسیع و عریض صحن بالکل خالی تھا۔ نیم تاریک برآمدے اور لالٹین کی مدھم روشنی میں' میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ بہت بوڑھی ہو گئی تھی اور آہستگی کے ساتھ جھک کر چلتے ہوئے' اس وقت وہ زمین پر بکھرے ہوئے برتن سمیٹ رہی تھی۔

میں اس روز بلاجھجک اور بلا اجازت برآمدے تک چلا آیا تھا۔ پکی اینٹوں کے فرش پر اٹھتے ہوئے میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ داہنی ہتھیلی کو آنکھوں پر لاتے ہوئے اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی اور حیرت کے ساتھ کچھ دیر مجھے تکتی رہی۔

"میں حامد ہوں۔"

"حامد!" اس نے نہ پہچانتے ہوئے میرا نام دوہرایا۔

"تھانیدار کا بیٹا حامد ـــــ میں شہر سے آیا ہوں۔ اب ہم وہیں رہتے ہیں۔"

"بسم اللہ ـــــ آؤ ـــــ آ جاؤ حامد ـــــ ادھر آؤ۔ میں نے ٹھیک طرح کبھی تمہیں دیکھا ہی نہیں۔"

میں آگے بڑھا تو اس نے جھک کر لالٹین اٹھا لی اور میرے چہرے تک لاتے ہوئے دیر تک اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے تکتی رہی۔ پھر اس نے مجھے ماتھے پر بوسہ دیا اور بولی:

"ماشاء اللہ' جوان ہو گئے ـــ تمہارا بابو کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہیں جی بس کچھ بوڑھے ہو گئے۔ گزشتہ سال تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے پر اب

گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے انہیں' چلنا پھرنا بہت کم ہو گیا۔"

"ہاں—— تم بھی تو جوان ہو گئے۔"

"بس جی' آپ کے سامنے ہوں۔"

"خدا تمہیں لمبی عمر دے۔ باپ کا سایہ قائم رکھے۔ مجھے اب دکھائی نہیں دیتا۔ آپریشن کروایا تھا۔ پہلے ایک آنکھ کا' پھر دوسری کا لیکن نظر ٹھہرتی نہیں۔ ڈھور ڈنگر سنبھالے نہیں جاتے تھے' اس لیے بیچ دیئے۔ اب گوالے تک جانا پڑتا ہے دودھ کی خاطر' ابھی ابھی لوٹی ہوں ادھر سے۔ تمہارا بابو چاچا تو ادھر ہوتا ہے نا۔ نیک بخت ہے۔ وہ لوگ اسے آنے ہی نہیں دیتے ادھر۔ اب تو سنا ہے بیمار رہتا ہے۔ ایک خط آیا تھا۔ اس سال ساون بھادوں میں چھٹی ملے گی تو آئے گا۔"

اس روز مجھے پہلے بار معلوم ہوا کہ انتظار کی عمر اتنی طویل بھی ہو سکتی ہے۔

"بیٹھ جا نا ادھر' موڑھے پر۔ سنا کیسے آیا تھا۔ خیر تو ہے نا؟"

"وہ—— ماں جی ہم سب ادھر آئے تھے موہن پورہ میں' دعا کے لیے۔ شام کو واپس چلے جانا ہے ہم نے۔ میں نے سوچا ادھر سے بھی ہوتا جاؤں۔"

"ہاں بیٹا' اچھا کیا۔ خون کی کشش ہوتی ہے' کھینچتا ہے اپنی طرف۔"

"وہ ماں جی——"

مجھ سے زیادہ دیر رہا نہیں گیا۔

"وہ ایک گراما فون تھا آپ کے گھر میں——"

"ہاں—— رکھا ہے۔ تمہارے بابو چاچا کبھی لائے تھے۔ اندر پڑا ہے۔ مجھ سے تو سنبھالا نہیں جاتا۔"

"ماں جی—— اب تو بابو چاچا بھول بھال گئے ہوں گے اسے——"

"ہاں بھول گیا—— تجھے چاہیے؟ تو لے جا——"

"ہاں ماں جی' مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"تو لے لے نا۔"

میں بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ اندر رکھا ہے۔ نیچے پٹاری میں ریکارڈ بھی ہوں گے۔ لیکن اتنے پرانے ریکارڈ اب تجھے کیا بھائیں گے۔ نئے لے لینا شہر سے۔"

یہ سن کر میں وہاں مزید کتنی دیر رکا' کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں نیم تاریک سیلن زدہ کمرے سے اسے اٹھا لایا' پرانے ریکارڈوں کی پٹاری سمیت۔ پھر شہر کیا آیا' بس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کالج' کالج سے یونیورسٹی۔ پہلے حصول تعلیم کے سلسلے میں جکڑا رہا' پھر طویل بے روزگاری کاٹی۔ ملازمت ملی تو شادی اور گھرداری کے الجھیڑوں میں پڑ گیا۔ گراموفون پر گرد جمتی چلی گئی۔

ایسا نہیں کہ ادھر جانے کا خیال نہیں آیا۔ بس یکے بعد دیگرے الجھتا چلا گیا۔ یہ زندگی کا پھیلاؤ مار گیا۔ بہت الجھیڑے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کام' بظاہر بہت معمولی' غیراہم' لیکن انہیں کیے بغیر چھٹکارا بھی نہیں۔ بہت سے کام نمٹا چکا' تب بھی ٹیلی فون کے بل کا جھگڑا ابھی باقی ہے۔ سوئی گیس کے بل کی درستگی اور پراپرٹی ٹیکس کا مسئلہ' پے بل کو کمپیوٹرائز کروانے کے لیے اکاؤنٹس آفس کا چکر ابھی رہتا ہے اور اسی میں تاخیر ہو گئی۔

ادھر سے وقفے وقفے کے ساتھ اپنے کاموں کے سلسلے میں شہر آئے ہوئے افراد سے ملاقات ہوتی تو جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل جاؤں۔ کئی بار سوچا کہ بڑے بیٹے کو سختی سے کہوں کہ ادھر سے چکر لگا آئے۔ یہ معلوم کر آئے کہ اب حویلی کے شب و روز کیسے ہیں۔ لیکن اسے وقت ہی نہیں ملتا۔ جانے کہاں رہتا ہے۔ ہمیشہ کہتا رہا کہ ابو کالج میں بہت مصروفیت ہے' ایک دن کے لیے بھی غیرحاضر نہیں رہ سکتا۔ اس نے کبھی ادھر جانے سے انکار نہیں کیا' لیکن گیا بھی نہیں۔

شہر کے اپنے معاملات ہیں۔ ادھر جاتا تو تاخیر سے آنے پر معذرت کر لیتا۔

یہی کچھ سوچتا آیا ہوں۔

لیکن آج معاملہ ہی کچھ ایسا آن پڑا کہ خجالت کے احساس نے کہیں کا نہیں رہنے دیا اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اطلاع ملتے ہی نکل کھڑا ہوا ہوں۔

وہ ایک اطلاع، جس کا مجھے ہمیشہ دھڑکا لگا رہا۔

آج صبح، حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا فائلیں نمٹا رہا تھا کہ خصوصی طور پر محض مجھی کو مطلع کرنے گاؤں سے ایک بھلا مانس چلا آیا۔ معلوم ہوا کہ حویلی بیک وقت اجڑی اور پھر سے آبادی بھی ہو گئی۔

"وہ کیسے ؟ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"جی کل رات چالیس برس بعد بابو چاچا حویلی لوٹ آئے ہیں، لیکن جب آئے ہیں تو ماں جی گزر گئیں۔"

"گزر گئیں!"

"آخری دنوں میں آپ کو یاد کرتی تھیں۔"

"مجھے؟ مجھے یاد کرتی تھیں؟؟"

میرے گرداگرد سڑتی ہوئی لاشوں کے انبار لگتے گئے۔ ایک کے بعد ایک، گدلے پانی میں بہہ کر آتی ہوئی۔

"دیکھتے نہیں کتنی تاریکی ہے۔۔۔۔۔۔ کمیٹی والے آج لیمپ پوسٹ روشن کرنا بھول گئے کیا؟"

"جی۔۔۔ جی میں تو آپ کو اطلاع کرنے آیا تھا۔ آپ آ رہے ہیں نا؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں آ رہا ہوں۔"

یہ دیکھنے کے لیے کہ اب اس حویلی کا واحد مکین کس حال میں ہے۔ وہ، جس نے اپنی

جوانی میں شادی کے بعد شاید دو راتیں بھی اس حویلی میں نہ گزاری تھیں۔

یہ سب پرانی باتیں ہیں' اور اس وقت جبکہ میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تو مجھے ادھر جانا ہے اور اسے دیکھنا ہے' جو اتنی مدت بعد پلٹا تو اسے حویلی خالی نہیں ملی۔ دو دھندلائی ہوئی منتظر آنکھوں نے اسے خوش آمدید کہا اور ہمیشہ کے لیے مندتی چلی گئیں۔

پھر میں چلا آیا' سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ اسی نیم تاریک سیلن زدہ کمرے میں' جہاں سے میں نے گراما فون اٹھایا تھا' پرانے ریکارڈوں سمیت۔

حویلی میں' بابو چاچا اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ پہچانتے بھی تو کیسے۔ انہوں نے کچھ بھی تو جواب میں نہیں کہا۔ یا شاید میں نے کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔

"آپ کو دیکھنے اور ماں جی کے لیے دعا کرنے حاضر ہوا تھا۔"

"ہاں بیٹا۔ موت برحق ہے اور یہ ایک رسمی کاروائی' کیے لیتے ہیں۔"

دعا کے بعد میں نے پوچھا:

"اب آپ اس حویلی میں اکیلے ہیں ۔ کیا محسوس کرتے ہیں ان کے چلے جانے کے بعد؟"

وہ تادیر خاموش رہے' پھر بولے:

"میں اس کا گنہگار ہوں۔ یہ تسلیم' لیکن میں قابل نفریں تھا' اسے جوانی میں اکیلا چھوڑ کر نکل گیا۔ پھر بھی اس نے مجھ سے کبھی نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ ایسا کرتی تو میں بخدا بہت پہلے لوٹ آتا۔ انتظار وہ کرتی رہی اور ہلاک میں ہوتا رہا۔ پر اب' جبکہ مجھے اس کی ضرورت تھی تو وہ گزر گئی۔"

بابو چاچا بولتے رہے اور میں بیٹھا سنتا رہا۔

واپسی پر آموں کے باغات میں نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ گدلے

پانی پر جھکی ہوئی سوکھی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں اور بہہ کر آنے والوں کو تھامنے کے لیے وہاں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

راجاجی کی سواری

یہ پھاگن کی ایک سرد رات کا قصہ ہے جب بارش تھی کہ کسی طور تھمنے کا نام نہ لیتی تھی اور دہقانوں کی اس بھری پری آبادی کے مکین گہری نیند سو رہے تھے۔ ایسے میں ایک مسافر گرتا پڑتا ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہاں پہنچا تھا۔ وہ کیچڑ میں لت پت تھا اور سنگ خارا کے ٹکڑوں اور مٹی سے چنی ہوئی دیوار میں جھولتے ہوئے دروازے کے سامنے لحظہ بھر کو ٹھہر گیا تھا۔

داستان گو کہتا ہے کہ اس کے پیچھے بھاری سامان سے لدا پھندا ایک خچر بھی تھا جو اپنے اوپر لدے ہوئے بوجھ تلے دوہرا ہو چلا تھا۔

مسافر کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے سردی سے کانپتے ہوئے نیلے ہونٹوں کو بمشکل تمام ابھی کھولا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ مسافر سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لپا ہوا تھا اور اس کی پہچان مشکل تھی۔

ایسے میں لالٹین کی زرد روشنی میں نہائے ہوئے ایک مضبوط جسم نے اس کی راہنمائی کی اور وہ اپنے خچر سمیت گوبر اور کیچڑ کی پھسلن سے بچتا بچاتا کھپریل کی چھت تلے پہنچ گیا۔ جھونپڑے کے اندر ٹخنوں تک سیاہ پانی بھرا تھا۔

مسافر نے دیکھا کہ اس کے سامنے صحن سے اندر آتے ہوئے گوبر ملے پانی میں کنارہ ٹوٹی ہوئی بدھنی کبھی اوندھی اور کبھی سیدھی ہو کر لڑھکتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے جھک کر اسے

اٹھا لیا۔ ابھی اس کے اوسان بحال نہیں ہوئے تھے اور وہ بدھنی ہاتھ میں لیے یوں ہی حیران کھڑا تھا۔

داستان گو کہتا ہے کہ اس اثنا میں صاحب خانہ نے خچر کو بھاری بوجھ سے آزاد کر دیا تھا اور سردی سے سمٹے سکڑے ہوئے اپنے دو جگرگوشوں کو ایک جھلنگا کھاٹ پر ڈال کر بہت جلدی میں مسافر کے لیے بستر درست کر رہا تھا۔

مسافر کو کچھ دیر بعد جب ہوش آیا تو اس نے گرم بستر پر لیٹے لیٹے کروٹ لے کر نیچے نگاہ کی۔ جہاں قدرے اونچے تھڑے پر صاحب خانہ اس کے سامنے اکڑوں بیٹھا تھااور چولہے پر چڑھی ہوئی ہنڈیا کے نیچے سیلے ہوئے ایندھن کو پھونکیں مار رہا تھا۔ اس کی بیوی کے سامنے پیتل کی پرات میں آٹا گندھا ہوا رکھا تھا اور گیلے ایندھن کے اٹھتے ہوئے دھوئیں میں ان دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

مسافر چت لیٹ گیا۔

اوپر کھپریل کی چھت جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی اور اس جا بجا ادھڑے ہوئی چھت کو مٹکے کے ٹھیکروں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پرانے بان سے کسے ہوئے دھوانس لگے بانس بارش کی شدت کے ساتھ ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہے تھے۔

مسافر کو اونگھ آ گئی۔

جب کھانا تیار ہوا تو اس کی نیند سے بوجھل پلکیں اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ اس نے شدید تھکن اور غنودگی کے ملے جلے احساس کے ساتھ پیٹ بھر کر کھایا اور سر مونہہ لپیٹ کر ایسا سویا کہ اگلے روز دوپہر دن تک پڑا سوتا رہا۔

جب وہ جاگا تو آسمان صاف تھا اور کھپریل کی چھلنی چھت سے روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اس وقت جھونپڑے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے انتہائی سرعت کے ساتھ اٹھ کر دیکھا کہ اس کا سامان کونے میں بہ حفاظت تمام پڑا تھا اور صحن میں دو ننگ دھڑنگ بچے اس کے

سامان اور خود اس کی موجودگی سے بے پروا کسی کھیل میں مگن تھے۔

مسافر دھیرے دھیرے چلتا ہوا باہر نکلا تو دونوں بچوں نے اسے دیکھ لیا اور بدحواس ہو کر' چیختے چلاتے باہر کی سمت بھاگے۔

داستان گو کہتا ہے کہ مسافر انہیں پکارتا ہی رہ گیا اور دونوں بچوں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ صحن میں کھلے آسمان تلے وہ حیران اور ششدر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

پھر اس نے دیکھا کہ میزبان اور اس کی بیوی اپنے کندھوں پر درانتیاں اڑسے اندر آئے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

مرد کے ننگے جسم پر صرف ایک تہمد جھول رہا تھا اور اس کی بیوی کے معمولی لباس میں بیسیوں پیوند لگے تھے۔ ان دونوں کی اوٹ میں بچے چھپ کر کھڑے تھے۔

مسافر انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔ اس نے اندر جا کر اپنی کمر میں اڑسے ہوئے خنجر کے ساتھ بندھے ہوئے سامان کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔

دونوں میاں بیوی نے اسی طرح ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور ان کے قدموں میں خالص سونے کے بندے' مندرے' انگلیوں کے گھنگھروؤں والے برہیالے' جھمکے' ہار' کنٹھ مالائیں' کن پھول' ڈھار' اچریاں' پائل' موہن مالائیں' بلاکڑیاں' کنگن' تمنیاں' گجریاں' چھندن' بازوبند' ٹیکے' پاسے' چنگریاں' جنکیاں' بندن چھن' پنجلڑے اور بھاری ستلڑے بکھرے ہوئے تھے۔

مسافر کہہ رہا تھا کہ اس میں سے جتنا چاہو اٹھا لو' اور وہ تھے کہ کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جب مسافر کا اصرار بڑھا تو مرد نے سب سے پہلے اپنی جان کی امان چاہی اور پھر عرض کیا:

"میرے آقا۔۔۔۔ میں نے دو لکڑیوں کو جوڑ کر کھیت میں کھڑا کرنے کو "بیچا" بنایا تھا' تاکہ فصلیں محفوظ رہیں۔ آپ نے اسے پسند فرمایا۔

میں نے اس کاٹھ کے نقلی چوکیدار کو اپنا موٹا جھوٹا پہنا دیا۔ حضور کو یہ سب اچھا لگا اور اپنے لشکریوں کو سرخ بانات کی وردیاں پہنا دیں۔

میں نے نقلی چوکیدار کے ہاتھوں میں جھوٹ موٹ کی تیر کمان تھما دی' تاکہ ڈھور ڈنگر فصلیں نہ اجاڑیں۔ حضور کو یہ سب اچھا لگا اور اپنے لشکر میں کمان داری کا عہدہ قائم کر دیا۔

میں نے نقلی چوکیدار کے سر پر اپنے گھر کی خالی ہنڈیا اوندھا دی۔ آپ نے یہ بھی پسند فرمایا اور ہماری تمام آبادیوں کے چورستوں پر کلیر بنوا دے' جن پر میرے بھائی بندوں کی مشکیں کس دی گئیں اور وہ چیل کوؤں کا کھاجا بن گئے۔

حضور' میں رات کے اندھیارے میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔۔۔۔ میرے آقا' میرے ماں باپ آپ پر نثار۔۔۔۔ آپ کے لشکریوں نے اس آبادی پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔ دہقانوں کی اس بستی میں آپ کی جان سخت خطرے میں ہے۔

میں آپ کا یہ سارا سامان سمیٹے دیتا ہوں۔ باہر آپ کا خچر تازہ دم کھڑا ہے' اس بوجھ کے ساتھ آپ کا دور تک ساتھ دے گا۔"

داستان گو کہتا ہے کہ مسافر کے پاس کہنے سننے کو زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بلاؤں نے اسے گھیرے میں لے رکھا ہو۔

اس نے اپنی بھاری چادر سے سر مونہہ اچھی طرح لپیٹ لیا اور اپنے لدے پھندے خچر کی باگ تھامے وہاں سے کسی نامعلوم منزل کی طرف نکل گیا۔

آوازیں

نئی نسلیں اپنے بڑے بوڑھوں سے سنتی آئی ہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔

کب ہوتا ہے؟ کیوں کر ہوتا ہے؟ کچھ پتا نہیں۔ بس ہوتا ہے۔

کوئی پکارتا ہے۔

اور صدیوں کے پھیلاؤ میں، یوں ہی لحہ بھر کے لیے وقت کروٹ لیتا ہے اور بس۔ ہم آواز کے رخ پر سفر کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔

اس روز بھی یہی کچھ ہوا۔

جب میں ڈیوٹی پر پہنچنے کے لیے اپنے گھر سے نکلا تھا اور میرے قدم، ہسپتال کی بجائے ریس کورس کی جانب نکل جانے والے رستے پر اٹھ گئے تھے۔ یہ میرا اس شہر میں پہلا دن تھا اور میں چہل قدمی کرتا ہوا، بے خیالی میں بھٹک گیا تھا۔

میرے لیے وہ راستہ نیا تھا پر جیسے کوئی کھینچے لیے جاتا تھا۔ اس روز آسمان صاف تھا اور میں شہر کے ہنگامے سے دور، آوارہ خرامی کرتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا۔

ریس کورس کی جانب سے پسینے میں تر، تھکے ہارے گھوڑوں پر چاک و چوبند جوکی، لانگ بوٹ اور چھجے والی ٹوپیاں پہنے، قطار در قطار واپس لوٹ رہے تھے اور میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا، ایک اجاڑ بنگلے کے پچھواڑے اکیلا رہ گیا تھا۔

میں وہاں کتنی دیر رکا ہونگا' کچھ پتا نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ سڑک پر دور دور تک کوئی نہیں تھا اور وہ قدیم طرز کی عمارت ٹھنڈے گہرے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں واپس مڑ چلا تھا کہ پیچھے سے دوڑ کر آتے ہوئے ایک بوکھلائے ہوئے بچے نے میرا راستہ روک لیا:

"کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟ ذرا میرے ساتھ آئیں۔"

میں انکار نہیں کر سکا اور اس تیز قدم اٹھاتے اور ہوا میں پیرتے ہوئے بچے کے پیچھے لشتم پشتم گھسٹتا چلا گیا۔ اس اجاڑ بنگلے کی حدبندی گزار کر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ طویل راہداریوں پر وہ میری راہنمائی کرتا' ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ پھر وہ مجھے اس عمارت کے طویل نیم تاریک برآمدے سے گزار کر ایک ہال نما کمرے تک لے گیا' جہاں دوہرے پلنگ پر سفید براق کمبل میں لپٹی لپٹائی ایک خاتون جانکنی کے عالم میں پڑی تھی۔

وہ یقیناً تیس سال سے زیادہ کی نہیں رہی ہو گی' لیکن اس وقت تو وہ ایک ہڈیوں کا پنجر تھی اور اس کا سانس اکھڑ چلا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ کی۔ اس کی تیمارداری کو وہاں کوئی نہیں تھا' البتہ وہ ہوا کے دوش پر سوار لڑکا۔

مجھے مریضہ میں زندگی کی کوئی رمق باقی نظر نہیں آئی' اور یہ کہ اس وقت میرے پاس سوائے سٹیتھو سکوپ کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس لڑکے کو چند ضروری ہدایات دیں اور ادویات کی پرچی لکھ کر تپائی پر رکھتے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

ہسپتال کے ہنگامے میں مجھے وہ مریضہ نہیں بھولی' لیکن میں وہاں نیا نیا تھا اور میری وہاں آمد سے متعلق لکھت پڑھت اکتا دینے والی تھی۔ پھر نئے ساتھیوں سے تعارف کا سلسلہ طول پکڑ گیا اور میں خواہش کے باوجود اس طرف' دوبارہ خبرگیری کے لیے نہیں جا سکا۔

اس واقعے کو کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور میں بھول بھال گیا تھا۔

آخر کیا کچھ یاد رکھا جائے۔ ہم لوگوں کے ساتھ تو اکثر ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن سنتے ہیں کہ صدیوں کے پھیلاؤ میں کبھی' یوں ہی لمحہ بھر کے لیے وقت کروٹ لیتا ہے اور بس۔

کوئی پکارتا ہے' اور ہم آواز کے رخ پر سفر کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔

آج بھی یہی کچھ ہوا۔

میں حسب معمول ہسپتال سے پہلی شفٹ بھگتا کر' تھکا ٹوٹا ہوا گھر لوٹا تھا کہ یکایک احساس ہوا جیسے کچھ بھول رہا ہوں۔ کوئی بات' جو بہت ضروری تھی۔ کوئی کام' جو رہ گیا' یا جیسے کسی سے ملنا تھا اور نہیں مل پایا تھا۔

یوں ہی کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا' لیکن ایک عجیب طرح کی بے چینی تھی جو کسی کروٹ چین نہ لینے دیتی تھی۔ سامنے میز پر سٹیتھوسکوپ چمک رہا تھا اور آپس میں باہم الجھے ہوئے گرم دستانے اس کے ساتھ دھرے تھے۔ سفید ایپرن البتہ اتار کر رکھنا یاد نہیں رہا تھا' سو وہ پہنے ہوئے تھا۔

ایک عجیب طرح کی بے چینی تھی۔ ہسپتال سے نکلتے وقت بھی میں بہت جلدی میں تھا اور دس منٹ پہلے ہی اٹھ آیا تھا۔ جیسے گھر پر کوئی ضروری کام ہو۔ لیکن گھر پہنچ کر پھر وہی بے چینی۔ بس' جیسے کوئی بات تھی' کوئی کام تھا' جو ہونے سے رہ گیا' یا جیسے کسی سے ملنا تھا۔ پر کس سے ملنا تھا؟ کوئی بھی تو نہیں تھا۔

میں نے کہا نا کہ وہاں میری جان پہچان نہ ہونے کے برابر تھی۔ آبادی میں کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا' جس سے میل ملاقات رہی ہو۔ ہسپتال کے سارے عملے سے کچھ ہی دن پہلے' اور زندگی میں پہلی بار ملا تھا۔ لیکن ان صدیوں کے پھیلاؤ میں کہیں انجانے میں کیا ہوا ایک وعدہ تھا' جو رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ وہ بات' جو کسی سے کہنا تھی اور کہہ نہیں سکا تھا یا کوئی کام جو تکمیل چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت کچھ بھی تو یاد نہیں آ رہا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میز کی ساری درازیں کھول کر ایک ایک کاغذ کا پرزہ پڑھ ڈالا۔ کتابیں الٹ پلٹ دیں ــــ پہنے ہوئے کپڑوں سمیت الماری میں ٹنگے ہوئے کپڑوں کے چھوٹے بڑے جیب دیکھ ڈالے۔ کچن میں' جہاں میں نے آج تک آگ نہیں جلائی تھی' ہو آیا۔ باتھ روم

میں ٹوتھ پیسٹ اور برش کے ساتھ تازہ کھولی ہوئی صابن کی ٹکیہ اور بالٹی پر ٹنگے ہوئے مگ کے علاوہ صرف ایک بلب روشن تھا' جو کچھ ہی دیر پہلے میں نے خود روشن کیا تھا۔ بالکنی کی ریلنگ خالی تھی اور ہینگر پر میری نیم خشک قمیض جھول رہی تھی۔ سب کچھ اپنی جگہ پر تھا۔ لیکن کچھ تھا' جو معمول سے ہٹ کر تھا۔ میں نے سب کچھ اسی طرح پڑا رہنے دیا اور میز پر سے سٹیتھوسکوپ اور دستانے اٹھا کر اپرن میں ہی باہر نکل آیا۔

میں ہسپتال کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا' تاکہ وہاں بھی جا کر اطمینان کر سکوں' لیکن میرے قدم ریس کورس کی جانب نکل جانے والے راستے پر اٹھ گئے۔ میں نے بہت چاہا کہ اس ویران سڑک کی طرف نہ جاؤں' لیکن قدم تھے کہ روکے نہیں رکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہاں اب کچھ بھی نہیں رہ گیا ہو گا' پر میں چلتا گیا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا اور سڑک کے دونوں اطراف میں سفیدے کے ستواں درخت چھتری بنے کھڑے تھے۔ میں دائیں ہاتھ کی خاردار تاروں کی باڑ اور بائیں طرف کے خاموش مگر آباد گھروں کی قطار کو گزار کر اس اجاڑ بنگلے کی حد بندی تک پہنچ گیا۔ میں شاید ریس کورس کی طرف دور کھلے میں نکل جانا چاہتا تھا' لیکن میرے پاؤں بوجھل ہوتے گئے اور میں ایک بار پھر اس ویران بنگلے کے گیٹ پر رکتا چلا گیا۔

اس وقت خاصی روشنی تھی اور عصر کی اذانیں ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میں جانے کتنی دیر وہیں ٹھہرا رہا۔ پھر میں نے ریس کورس کی طرف نکل جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور زنگ آلود آہنی گیٹ کو اندر کی جانب دھکیل کر اس پختہ راہداری پر چل نکلا' جس کی سرخ اینٹیں رات کی بارش نے دھو ڈالی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ آپس میں الجھتی اور ہر طرف پھیلتی ہوئی گھاس کی کٹائی کو ایک عرصہ ہو چلا ہے اور زردی مائل نم گھاس پر گیلے پتوں کے انبار لگے ہیں۔ پختہ راہداری کی دونوں جانب انجیر اور چنار کی دو رویہ قطاروں میں کسی اکیلی فاز کی چیخ میرے لیے راستہ بناتی چلی جا رہی تھی۔ شام کی بہتی ہوئی ہوا میں ابھی ہلکی ہلکی خنکی کا احساس باقی تھا اور میں اپنی دھن میں نیم تاریک برآمدے کی سیڑھیوں تک جا نکلا تھا۔

یکایک کھانستا کھنکارتا ہوا ایک سایہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر میرے سامنے آ ٹھہرا۔

"صاحب ---- کس طرف جانا ہے آپ کو؟" سن رسیدہ چوکیدار نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں ایک مریضہ کو دیکھنے آیا تھا' میں ---------- بہت دن ہو گئے' پھر آنا ہی نہیں ہوا اس طرف----" میں نے جواب میں کہا' اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"جی---- کب کی بات کر رہے ہیں آپ؟ یہاں تو کوئی نہیں رہتا۔ مجھے یہاں چوبیس برس ہو گئے' چوکیداری کرتے۔ ہاں مجھ سے پہلے شاید----"

"اچھا' لیکن میں تو یہی کوئی ہفتہ پندرہ دن پہلے آیا تھا یہاں۔" میں وہیں ٹھہر گیا۔

"صاحب---- بھول رہے ہیں آپ۔ میں تو رات دن یہیں ہوں۔ البتہ کبھی بازار تک ہو آتا ہوں۔ اور بس-----"

میں اس سے کیا بحث کرتا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور میں وہاں سے چل دیا تھا' لیکن میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ ایسے میں اس نے مجھے سنبھالا دیا اور دو گھڑی وہیں رک جانے کو کہا۔ وہ اور جانے کیا کچھ کہتا رہا تھا' لیکن میں کچھ بھی تو نہیں سن پا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد' میں اس کے پیچھے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

اندر کا نیم تاریک راستہ میرا دیکھا بھالا تھا' اور وہ مجھے برآمدے سے گزار کر ڈرائنگ روم کی طرف لے جانا چاہتا تھا' لیکن میری نظریں ہال نما کمرے کی متلاشی تھیں۔ پھر میں چلتے چلتے ٹھٹک کر ایک پیتل جڑے دیوہیکل دروازے کے سامنے ٹھہر گیا اور اس نے میرے اصرار پر دروازہ کھول دیا۔

میں نے دیکھا کہ خالی کمرے میں دوہرے پلنگ پر سفید براق کمبل تہہ کیا رکھا ہے اور بس۔ میں نے خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ کر تپائی پر سے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ اٹھا لیا۔ اس پر

چند ہی روز پہلے کی تاریخ درج تھی۔

میں چوکیدار سے کیا بحث کرتا۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا۔

جب باہر نکلا ہوں تو یاد آیا کہ چوکیدار سے اس ہوا کے دوش پر سوار لڑکے کے بارے میں پوچھنا تو میں بھول ہی گیا۔ باہر کی خاموش سرد راہداری پر سے گزرتے ہوئے میں نے اوپر نگاہ کی، جہاں انجیر اور چنار کے درختوں پر ان گنت ستارے جھک آئے تھے اور شفاف سیاہ آسمان پر ٹھہرے ہوئے چاند کا رنگ زرد تھا۔

اَندھی گلی

وہ دن اکتاہٹ، بے چینی اور مایوسی کے تھے۔

میں بے روزگار تھا اور بھرے پرے شہر میں اکیلا۔ میرے لیے رات اور دن ایک تھے۔ راتوں کو جاگتا اور دن کو سوتا رہتا تھا۔ میرے ساتھ شہر کے تمام فٹ پاتھ، تفریحی پارک اور دن رات کھلے رہنے والے چائے کے کھوکھے شدید اکتاہٹ، بے چینی اور مایوسی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اوائل جوانی کی ان اونگھتی ہوئی شاموں میں سے ایک شام میرا گزر اندرون شہر کی ایک تنگ و تاریک، نیم روشن گلی میں سے ہوا۔ میں چلا جا رہا تھا اور گلی کہیں ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

اس روز میں کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا اور اس نہ ختم ہونے والی گلی میں سے گزرتے ہوئے اپنے وجود کو بڑی مشکل سے گھسیٹ رہا تھا۔ ایسے میں کئی بار میں نے واپسی کا سوچا، لیکن جانے کب سے چلا آتا تھا اور میرے لیے دوبارہ اتنی مسافت طے کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے آگے، اور آگے چلتا گیا۔

وہ گلی اس قدر تنگ تھی کہ سامنے سے آنے والوں کے لیے دیوار کے ساتھ لگ کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ ایسے میں یکایک یوں محسوس ہوا، جیسے میرے بہت آہستہ چلنے کے سبب پیچھے

سے آنے والوں کو مشکل پیش آ رہی ہے۔ اس خیال نے مجھے اور زیادہ بدحواس کر دیا' لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس سے زیادہ تیز چلنا میرے لیے محال تھا۔

میں نے دو ایک بار رک کر راہ گیروں سے پوچھا بھی کہ یہ گلی کہیں ختم بھی ہو گی یا نہیں' لیکن شاید وہ بہت جلدی میں تھے اور میں ہانپ گیا تھا۔ پھر میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا اور شاید اپنے وجود کو زیادہ دیر تک اپنی تھکی ہوئی ٹانگوں پر نہ سہار سکنے کے باعث اس نیم تاریک گلی میں ڈھیتا چلا گیا تھا۔ معاً خیال آیا کہ اس گلی میں سے تو جنازے کی چارپائی گزرنا بھی مشکل ہے۔ اس خیال نے میرے حواس بحال کر دینے کے ساتھ کسی قدر توانائی کا بچا کھچا ذخیرہ بھی فراہم کر دیا اور میں ایک بار پھر اپنے وجود کو آگے کی سمت گھسیٹنے کے قابل ہو سکا۔

میں اس طرف کیوں نکل آیا تھا۔ یہ سوچ کر سخت پشیمان تھا کہ یکلخت اس اندھی گلی کے ایک بند دروازے کے پیچھے سے ڈھولک کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی' پھر بھرا مار کر جیسے چڑیاں نکلتی ہیں' اس دروازے کے پیچھے سے جوان لڑکیوں کا جھنڈ نکلا اور میرے برابر سے ہو کر آگے نکل گیا۔ لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں میں روشن ہنڈے اور لالٹینیں تھام رکھی تھیں اور میں ان کے معصوم قہقہوں کی باڑ پر بہتا چلا گیا تھا۔ مجھے اس تنگ و تاریک گلی میں پہلی بار زندگی کا احساس ہوا تھا اور میں لشتم پشتم زندگی کے پیچھے ہو لیا تھا یا شاید اس کی زد میں تھا۔

یکلخت گلی ختم ہو گئی۔

سامنے پرشور سڑک تھی' جس پر دوطرفہ ٹریفک رواں تھی۔ سکوٹروں' موٹررکشوں اور بسوں کی لمبی قطاروں اور مرقری قمقموں کی چکاچوند میں موت فراٹے بھرتی گزر رہی تھی اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ لڑکیوں' چڑیوں کا جھنڈ' بھرا مار کر جانے کس طرف کو اڑ گیا' کچھ پتا نہ چلا۔ مجھے اس اچانک تبدیلی کے احساس نے حیران کر دیا۔

گلی کے اختتام پر میرا دیکھا بھالا ایک نیم تاریک چائے کا کھوکھا' اس تنگ گلی اور پرشور سڑک کے درمیان جیسے ایک پل تھا اور اس پل پر سے ہو کر ہی دوسری سمت نکلا جا سکتا تھا۔

حیرانگی کی بات یہ تھی کہ اس چائے کے کھوکھے پر میری اکثر بیزار شامیں گزری تھیں لیکن اس اندھی گلی کی طرف میرا دھیان اس سے قبل کبھی نہ گیا تھا۔ اس شدید حیرانگی کے احساس سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجھے کچھ وقت درکار تھا اور میں حسب معمول کھوکھے کے سامنے جھولتی ہوئی ایک کرسی پر گر گیا تھا۔

"چائے۔" میں بہ مشکل تمام کہہ پایا تھا' لیکن مجھے یقین ہے کہ اس وقت میری آواز گلے تک پہنچنے سے پہلے ہی کہیں کھو گئی تھی۔

مجھے کرسی میں جھولتے دیکھ کر کھوکھے کا ادھیڑ عمر مالک' غنودگی کے عالم میں چلتا ہوا میرے سامنے چائے کا مگ رکھ کر واپس اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ میں نے اپنے دائیں بائیں نگاہ کی اور برقی قمقموں کی تیز روشنی اور دوطرفہ ٹریفک کی یلغار کے باوجود میری آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

میں جانے کتنی دیر تک اس جھولتی ہوئی کرسی پر بے سدھ پڑا رہا تھا۔ جب آنکھ کھلی ہے تو صبح کے آثار نمایاں تھے۔ چائے کے اس کھوکھے کے گرداگرد بدحواس مردوں کا بہت بڑا ہجوم تھا اور سامنے والی تنگ گلی سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔

"چائے ویسی کی ویسی پڑی رہ گئی۔" کھوکھے کا ادھیڑ عمر مالک میرے سامنے رکھی' ٹھنڈی چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"بابا۔۔۔۔ یہ عورتیں کیوں رو رہی ہیں؟"

میں نے گہری نیند سے بیدار ہوتے ہوئے سوال کیا۔

میرے سامنے رکھے ہوئے اسٹول پر جھاڑن پھیرتے ہوئے اس نے کچھ تامل کیا' پھر صرف اتنا کہا: "اللہ کے کام ہیں بیٹا۔"

"لیکن بابا۔۔۔ میں نے تو اس گلی سے ڈھولک کی تھاپ خود سنی ہے۔ بڑی زندگی تھی'

یہاں کل رات ــــ یہ کیا ہو گیا بابا؟"

اب میں پورے ہوش و حواس میں تھا اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"بابو جی ــــ جس لڑکی کی شادی تھی نا ــــ وہ بغیر کسی کو بتائے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بازار گئی تھی' اپنی پسند کی چوڑیوں کا انتخاب کرنے یا شاید کوئی اور بات تھی ــــ ایک کار اسے کچلتی ہوئی نکل گئی ــــ وہ تو بے چاری کہتی رہی کہ مجھے گھر لے چلو ــــ گھر لے چلو' لیکن لوگ باگ اسے ہسپتال لے گئے۔ حالت بہت خراب تھی اس کی۔ ہسپتال میں ہی مر گئی۔"

"مر گئی؟"

"ہاں بیٹا۔ سب اوپر والے کے کام ہیں۔"

مجھے اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور اس کے بعد میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکا تھا۔ چائے کے پیسے ادا کر کے اٹھ آیا تھا۔

بہت پرانی بات ہو گئی۔

میں اس واقعہ کو تقریباً بھول بھال گیا تھا کہ آج بیس برس بعد اپنے بیوی' بچوں کو ریلوے اسٹیشن چھوڑ کر گھر واپس آتے ہوئے' میں نے خود کو اسی تنگ و تاریک گلی میں ہانپتا ہوا محسوس کیا' جہاں سے جنازے کی چارپائی گزرنا بھی محال تھی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوئے اور گلی میں ذھیتے ہوئے' میں نے ایک را ہگیر سے پوچھا: "یہ گلی کہیں ختم بھی ہو گی یا نہیں؟"

منچلے راہ گیر نے شرارت سے آنکھیں جھپکیں اور بولا: "یہ تو پیدل چلنے والوں سے پوچھو ــــ میں تو فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی پر سوار ہوں۔" اس نے اتنا کہا اور زور زور سے پیڈل مارتے ہوئے' سائیکل پر یہ جا' وہ جا ــــ

کتنی حیران کن بات ہے کہ آج میں اپنی گاڑی کی آرام دہ نشست پر تھا اور وسیع و عریض مال روڈ پر اڑتے پھرتے اس اندھی گلی میں سے گزرنے کا گماں ہوا تھا۔ بچوں کو اسکول کالج سے دو ماہ کی چھٹیاں مل گئی تھیں اور وہ اپنی ماں کے ساتھ کچھ دن کے لیے گاؤں چلے گئے

تھے۔ میں ہر سال ان دنوں میں ان کے ساتھ خود بھی گاؤں کا چکر لگا لیتا ہوں لیکن اس بار کچھ ایسے کام آ پڑے تھے کہ ان کے ساتھ نہ جا سکا تھا۔ سو میں اکیلا تھا اور اسٹیشن سے واپسی پر یونہی بے کار پٹرول پھونکتا پھرتا تھا۔

کئی برس گزر گئے' میں اندرون شہر کی زندگی سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ جانے کیا سوچ کر میں پرانے شہر کی طرف نکل گیا۔ پرانے شہر کی گلیوں میں' جہاں میں نے بے روزگاری کے دن گزارے تھے۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے تادیر چہل قدمی کرتا رہا اور خواہ مخواہ دکانیں جھانکتا پھرا۔

پرانی آبادی میں ایک دوکان کے باہر پرانے گھڑیال لٹک رہے تھے۔ برسوں سے رکے ہوئے' سوئیوں اور پنڈولم کے بغیر گھڑیال۔ بچپن میں کتنی خواہش تھی پنڈولم کے ساتھ چلتے ہوئے گھڑیال کو دیکھنے کی۔ ان میں سے کسی ایک کو تو ٹھیک کروایا جا سکتا ہے' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

دکان کے اندر قدرے تاریکی تھی۔ میں نے جھک کر اندر دیکھا تو وہاں گھڑی ساز کی بجائے حجام ایک لڑکے کے بال تراش رہا تھا' جبکہ مجھے گھڑی ساز کی تلاش تھی۔

حجام بولا: "بابو جی ـــ اندر آ جائیں۔"

میں نے کہا: "مجھے بیٹھنا نہیں ہے بھائی۔ کیا تم گھڑی ساز بھی ہو؟"

"نہیں ـــ بال کاٹتا ہوں۔" حجام نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ گھڑیال کیوں لٹکا رکھے ہیں باہر؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تو اور کیا لٹکاؤں بابو جی؟ بال کاٹتا ہوں۔ گھڑیال ہی لٹکیں گے باہر۔"

مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ ریلوے اسٹیشن سے واپسی پر عجیب لایعنی واقعات پیش آتے رہے تھے۔ میں جھنجلا کر دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھا۔ اب میں گھر لوٹ جانا چاہتا تھا' لیکن ابھی بڑی سڑک پر آ کر پہلا موڑ ہی کاٹا تھا کہ سرخ جوڑے

میں بجی سجائی ایک جوان لڑکی اچانک سامنے آ گئی۔ میں اگر بروقت بریک نہ لگاتا تو وہ نیچے آ گئی تھی یا شاید وہ نیچے آ ہی گئی تھی۔ اس لیے کہ جب میں غصے میں بھرا نیچے اترا ہوں تو وہ سڑک کے بیچوں بیچ سخت زخمی حالت میں پڑی تھی۔

میں گھبرا گیا اور اسے سہارا دے کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں اسے جلد از جلد ہسپتال پہنچانا چاہتا تھا' اس لیے تیزی سے نکلا ہوں۔ جب میکلوڈ روڈ کا موڑ کاٹنے لگا تو اس نے ادھر جانے سے منع کر دیا۔ وہ اکھڑے ہوئے سانسوں کے ساتھ اندرون شہر لے جانے کی التجا کر رہی تھی' سو میں گھبراہٹ میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل دیا۔

اس نے جس جس جگہ گاڑی روکنے کا کہا' وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ گلی کی نکڑ پر شدید اکتاہٹ' بے چینی اور مایوسی میں ڈوبا ہوا چائے کا کھوکھا وہاں اب بھی موجود تھا اور اس کے سامنے کرسیوں پر جھولتے ہوئے نوجوان اب بھی اونگھ رہے تھے۔ میں نے لڑکی کو سہارا دے کر نیچے اتارا' وہ خون میں لت پت تھی۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ بغیر دستک دیئے ایک گھر میں گھس گئی اور میں باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔

میرے طویل انتظار کے بعد بھی جب گھر سے کوئی نہ نکلا تو میں نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری بار دروازہ کھٹ کھٹانے پر کھانستا کھنکارتا ہوا ایک بڈھا باہر نکلا تو میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے لمبی تمہید باندھی' لیکن وہ لاتعلق سا کھڑا رہا۔ ساری بات سن کر وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر کی طرف مڑ گیا۔

میں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر گیا ہوں۔ گھر میں موت کا سکوت تھا۔ مختصر سا صحن الانگھ کر ہم دونوں ایک کمرے میں پہنچے ہیں' جہاں دیوار کے ساتھ ایک پرانی نامکمل پینٹنگ لٹک رہی تھی۔ تصویر میں ایک نیم تاریک' چائے کا کھوکھا تھا اور اس کے سامنے ایک نوجوان کرسی پر اونگھ رہا تھا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ یقیناً میری جوانی کی تصویر تھی۔

بڈھے نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"میں نے تجھے پہچان لیا ہے بیٹا۔۔۔۔ اس کی شادی ہم نے بچپن سے طے کر رکھی تھی۔۔۔۔۔ مجھے کیا پتا تھا بیٹا۔۔۔۔ اس کی ماں جو نہیں تھا' باپ سے کیسے کہتی۔۔۔۔ شادی سے دو دن پہلے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ چوڑیاں چڑھانے نکلی تھی یا شاید کوئی اور بات تھی۔۔ میں نے اسے خون میں لت پت ہسپتال میں دیکھا۔ وہ بے چاری کہتی رہی کہ مجھے گھر لے چلو' گھر لے چلو' لیکن لوگ باگ اسے ہسپتال۔۔۔ خیر جانے دو۔ مل کر چائے پیتے ہیں۔ تمہارے پاس وقت ہے نا؟"

بڈھے نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو قمیض کی آستین سے پونجھتے ہوئے تیل کے چولہے پر چائے کے لیے پانی چڑھا دیا۔

اس سیلن زدہ کمرے میں بہت سی تصویریں جابجا بکھری پڑی تھیں اور سامنے کی دیوار پر جھولتی ہوئی تصویر میں چائے کے نیم تاریک کھوکھے کے سامنے کرسی پر میں تھا جو اونگھ رہا تھا۔ یہ ان دنوں کی تصویر تھی جب میں بے روزگار تھا اور پیچھے کی طرف بال بناتا تھا۔ اکثر گرمیوں میں بھی میرے گلے کے گرد مفلر لپٹا رہتا۔ اس تصویر میں بھی یقیناً جاڑے کا موسم نہیں تھا اور میرے گلے میں لمبا مفلر جھول رہا تھا۔
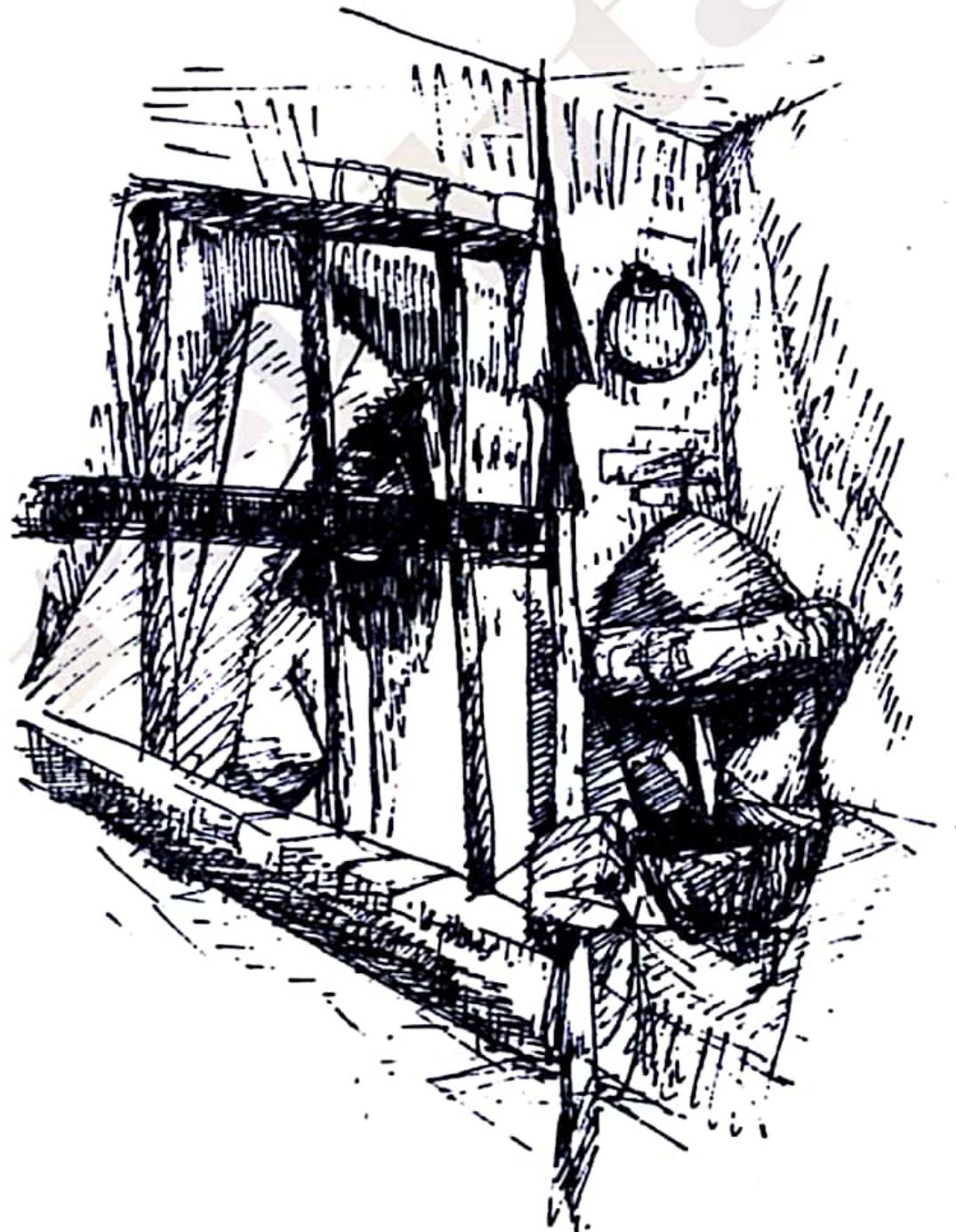
دستک

گزشتہ رات، معمول سے ہٹ کر کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا بچے تادیر چہکتے رہے، تاوقتیکہ موسم سرما کی تعطیلات سے متعلق پروگرام بناتے بناتے ہم سب حسب معمول گہری نیند سو گئے۔

رات کا دوسرا یا تیسرا پہر ہو گا، جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دھیرج کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہو، یا جیسے دروازے پر دستک ہوئی ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ جڑ کر لیٹا ہوا چھوٹا بیٹا بے خبر سو رہا تھا اور برابر کے پلنگ پر بیگم اور منی۔ لیکن نیند اچٹ گئی اور میں بدحواس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چنبیلی کی خوشبو سارے گھر میں بھری ہوئی تھی۔ شاید رات کو باہر کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ اس خیال نے مزید پریشان کر دیا یا شاید اس خوشبو کے احساس نے۔ جبکہ چنبیلی کا پودا تو ہمارے قرب و جوار میں کہیں نہیں تھا۔

اپنے کندھوں پر گرم شال لیتے ہوئے، میں ڈرائنگ روم سے گزر کر محتاط قدموں کے ساتھ ٹی وی لاؤنج تک آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باہر کا دروازہ واقعتاً کھلا ہوا تھا۔ انجانے خوف کے تحت میں نے ایک ایک کر کے گھر کے سارے بلب روشن کر دیئے۔ باتھ روم اور کچن میں جھانکا، ٹیرس پر سے ہو آیا۔ وارڈ روب دیکھ لیے، پلنگ کے نیچے اور پردوں کے پیچھے دیکھ بھال کر ہر طرح کا اطمینان کر لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی لیکن طبیعت میں ایک بے چینی سی تھی۔ اک

انجانا سا خوف اور چنبیلی کی خوشبو سارے گھر میں بھری ہوئی تھی۔

میں حیران کھڑا تھا کہ اچانک باہر کھلنے والے دروازے کی سمت سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ جیسے وہاں کوئی تھا اور ابھی ابھی سیڑھیاں اتر گیا ہو۔ میں ایک لحظہ کے لیے رکا اور پھر بلاسوچے سمجھے میں بھی سیڑھیاں اتر گیا۔

میں نے دیکھا کہ رات کو پڑنے والی نرم برف پر انسانی قدموں کے مانند پڑتے ہوئے نشانات تھے۔ کوئی ننگے پاؤں چلتا ہوا نکل گیا تھا۔ یہ کون ہو سکتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا' یا شاید نیند کا خمار ابھی ٹوٹا نہیں تھا اور میں اپنی اس دلیری پر حیران اور ششدر' پلٹنا چاہتا تھا کہ کارپورچ کے ستون کے پیچھے' زیرو پاور کے رات بھر جلنے والے بلب کی مدھم نیلی روشنی میں' میں نے اسے دیکھا۔

وہ کوکی تھی۔ بلا شک و شبہ' وہی بیس برس پہلے کا ناک نقشہ۔ بالکل ویسی کی ویسی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتے' لڑتے جھگڑتے اور اسے چڑاتے ہوئے میرا لڑکپن گزرا تھا اور جسے اوائل جوانی میں ٹوٹ کر چاہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور اس نے صرف ایک ہلکی سی چادر لے رکھی تھی۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چنبیلی کا ہار تھا۔

میں حیران کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ ویسی کی ویسی تھی اور ان بیس برسوں میں میرے سر کے بال سفید ہی نہیں ہوئے بلکہ کافی حد تک جھڑ چکے تھے۔ اس کی مخروطی انگلیاں اسی طرح ملائم تھیں اور ان میں چنبیلی کا ہار جھول رہا تھا۔ اس کی پیشانی کی چمک' رخسار اور ہونٹوں کی تپش ویسی ہی تھی' یا شاید مجھے محسوس ہوئی۔ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی' بس حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس وقت فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ اسی طرح ساکت و جامد' کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چنبیلی کا ہار تھامے کھڑی رہی' مونہہ سے کچھ نہیں بولی۔ لیکن جب میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر لینے کو آگے بڑھا تو اس نے مونہہ پھیر لیا۔ اس کے اٹھے ہوئے بازوؤں میں چنبیلی کا ہار

اسی طرح کانپ رہا تھا۔ پھر میں نے وہ ہار ہمیشہ کی طرح لے کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس اثنا میں وہ مڑ چکی تھی اور نرم برف پر چلتے ہوئے اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ میں نے اسے آواز دی' لیکن وہ رکی نہیں۔ میں نے اسے دوڑ کر روکنا چاہا تو گھٹنوں تک برف میں دھنس گیا اور وہ تھی کہ سبک قدموں کے ساتھ جیسے برف پر پیرتی چلی جاتی تھی۔ میں بڑی مشکل سے شوالہ کی جانب اتر جانے والی کھڑی ترائی تک چل کر آیا' لیکن ترائی سے آگے وہ نہیں تھی۔

میں وہیں ٹھہر گیا۔ وہ یکلخت کدھر نکل گئی' کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر مجھے اپنے حواس کو مجتمع کرنے کے لیے شاید بہت وقت لگ گیا۔ صبح کی سپیدی میں' میرے سامنے حد نگاہ تک ہر طرح کے نشانات سے پاک برف ہی برف تھی۔ میں پلٹا' اپنے گلے کا ہار اتار کر پورچ کے ستون کے ساتھ ٹانگ دیا اور خوف ملی حیرانی کے ساتھ گھر کی سیڑھیاں چڑھ آیا۔

اس وقت میری بیوی جاگ چکی ہے اور کچن میں مصروف ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں اتنی دیر کہاں رہا۔ شاید اس نے یہ خیال کیا ہو کہ مجھے جاگے ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا اور رات کی برف باری کے بعد میں چہل قدمی کو نیچے اتر گیا ہوں۔

میں وہ دن یاد کرتا ہوں' جب سارا ٹھٹھہ تف تف کر رہا تھا۔ جھلار والے کنویں کی سمت پانی بھرنے کے لیے رواں لڑکیوں کی قطار کی رفتار ست پڑ گئی تھی' حجروں میں چلموں کی گڑگڑاہٹ اونچی سرگوشیوں میں دم توڑ گئی تھی اور مغلوں کے حجرے میں تمباکو پینے والے کمیوں نے شام کی بیٹھک ترک کر دی تھی۔

کوکی سے میرے میل جول کی اطلاع اجی کو قدرے تاخیر سے ملی' لیکن انہوں نے دیر نہیں کی۔ بپھر کر کارنس سے اپنی تلوار اتار لی اور غصے میں کانپتے ہوئے صرف اتنا کہہ پائے کہ اگر میرا بیٹا حلالی ہے اور مغل خون ہے تو رقعہ پڑھتے ہی شہر سے فوراً واپس آئے گا' لیکن پہلے میں اس نمک حرام فیکے کی گردن ماروں گا۔

اس وقت میں شہر میں تھا اور یہ سب میری جنتی ماں نے بتایا تھا۔ ایسے میں اجی کو کون

روکتا۔ حویلی میں پٹس پڑ گئی اور وہ میری روتی کرلاتی ہوئی ماں کو پیچھے دھکیل کر صدر دروازہ الانگھ گئے۔ میرے اجی کا گاؤں کی گلیوں میں یوں نکلنا تھا کہ دم بھر میں' بھری پری آبادی ویران ہو کر رہ گئی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے اور جب تک وہ فیکے کمہار کے دروازے پر دستک دیتے' فیکا اپنی بیٹی کوکی سمیت غائب ہو گیا۔

اس روز اجی' ڈولتے سنبھلتے ساری آبادی میں گھوم گئے لیکن فیکے اور کوکی کا سراغ کہیں نہ پایا۔ وہ سخت حیران تھے کہ ان دونوں کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ دن اور وہ رات' ان کے غصے کی تلوار خود انہی کے لہو میں نیام ہوتی رہی۔

اگلے روز انہوں نے اعلان کیا کہ آبادی میں کوئی ننگے سر نہیں نکلے گا اور جرنیلی سڑک سے گاؤں کی سمت آنے والے راستوں پر کوئی سوار نہیں آئے گا۔ گزرگاہ سے سب اونٹ کی نکیل اور گھوڑے کی باگیں تھام کر پیادہ پا گزریں گے' مبادا مغل حویلی کی بے پردگی ہو۔ یہ اعلان کر چکنے کے بعد انہوں نے منشی کو طلب فرمایا اور میرے نام شتاب گھر لوٹنے کا رقعہ لکھوایا۔

ادھر میں' اپنے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں' کوکی کا دیا ہوا کڑا بازو میں پہنے' کمہلائی ہوئی چنبیلی کا ہار گلے میں ڈالے اور سینے پر عطر چنبیلی ملے' صرف نیلے رنگ کی پتلون اور تسمہ والی چپل میں گھومتا تھا۔

جب اجی کا خط ملا تو یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا۔ لڑکپن گزار کر جوانی کی سرحد پر کوکی سے میں ملا ہی کتنی بار تھا۔ میں نے تو اکثر اسے گھنٹوں انتظار کروایا تھا۔ ملنے کا وعدہ کر کے بھول جاتا تھا۔ لیکن یہ سب جیسے پلک جھپکتے میں ہو گیا۔

میں نے وارڈن کے کمرے میں بیٹھ کر چھٹی کی درخواست لکھی اور گاؤں کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میں ابھی جرنیلی سڑک پر اترا ہی تھا کہ کیما آجڑی مل گیا۔ اس نے چرتے ہوئے ڈھور ڈنگروں کو وہیں چھوڑ کر میرا کتابوں اور کپڑوں سے بھرا ہوا اٹیچی کیس اٹھایا اور خاموشی سے آگے

ہو لیا۔ وہ چپ چپ تھا اور میرے ہر سوال کا جواب صرف ہاں یا نہ میں دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے روک کر پوچھا تو کہنے لگا:

"نیکا' کیا بتاؤں۔۔۔ تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنو گے۔ چھوڑو' جو ہوا سو ہوا۔"

میں چکرا گیا اور اٹیچی کو ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے سر پر سے کھینچتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔

"اب بول بھی۔ بتاتا کیوں نہیں۔ ہوا کیا ہے؟"

"کیا ہونا تھا نیکا۔ تمہاری کھیل تھی اور کسی کی زندگی اجڑ گئی۔ غریب غربا کا کیا ہے۔ بس یوں ہی گزر جاتے ہیں۔"

"اوئے' کون گزر گیا؟ اب بک بھی۔"

"نیکا۔۔۔ اللہ تمہیں حیاتی دے۔ بس یوں سمجھ کہ فیکے کی بیٹی کوکی گزر گئی۔ تم ٹھہرے مغلوں کی اولاد' اور وہ بے چاری۔۔۔ میل ہو تو کیسے؟"

"گزر گئی۔"

مجھے چکر سا آگیا اور اس کی بات پوری طرح نہ سن سکا۔

"پتر۔۔۔۔ تیرہ برس کی لڑکی کسی بڈھے ٹھڈے سے بیاہ دی جائے تو گزر ہی گئی نا۔"

"پر یہ ہوا کیسے؟ کیسے ہوا یہ سب ؟؟"

میں گاؤں پہنچنے تک یہی رٹ لگائے رہا' لیکن وہ سر پر اٹیچی تھامے' تیز تیز قدم اٹھاتا' بس چلتا گیا۔

حجرے کے سنگی ساتھیوں نے بتایا کہ جس روز ابی کو پتا چلا ہے' اس کے اگلے روز شام کو فیکے اور کوکی' دونوں باپ بیٹی کو مستان شاہ کے دربار کے پچھواڑے سے برآمد کر لیا گیا۔ پہلے تو دونوں کو تھی مار دی گئی اور پھر عشاء کی نماز کے فوراً بعد کوکی کا نکاح' اس کے باپ کی عمر کے ایک کمہار سے پڑھوا دیا گیا۔

میں نے یہ سنا اور چپ چاپ حویلی کی سمت چل دیا۔

لیکن کوکی کو میرے گاؤں پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اپنے گھر سے نکل کر ہماری اونچی ماڑی کے چھجے پر جا بیٹھی تھی۔ سارا گاؤں نیچے حیران کھڑا تھا اور وہ ہماری ماڑی کے روشن دانوں سے جھانکتے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے رو رو کر میری والدہ سے ایک ہی التجا کیے جاتی تھی:

"او مائے! نی مائے!! تیرے روشن دانوں میں بیٹھی رہوں گی' جاؤں گی نہیں۔ مجھے یہیں بیٹھے رہنے دے۔"

پھر میں اپنے صحن میں نکل آیا اور وہ مجھے بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ روئی نہیں' چیخی نہیں۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ میرے دیکھتے دیکھتے' ہمارے ملازموں نے اسے کھینچ کھانچ کر چھجے پر سے اتارا' ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور اس کے گھر لے جا کر باہر سے کوٹھڑیا کی کنجی چڑھا دی۔ میں گاؤں میں ہوتے ہوئے' کچھ بھی نہ کر پایا۔

میں نے بتایا تا کہ اس وقت میں نے میٹرک کے بعد نیا نیا کالج میں داخلہ لیا تھا۔

امی نے میرے بازو سے اس کا دیا ہوا کڑا اتار لیا اور منشی کے ہمراہ مجھے دوبارہ شہر بھیج دیا۔ اب میرے گاؤں آنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ شام کو وارڈن باقاعدگی سے میری کمرے میں موجودگی کا ریکارڈ رکھتا اور امی کو بلاناغہ خط لکھ کر میری پروگریس سے مطلع کرتا۔

بورڈنگ ہاؤس میں میرے پاس اس کی دو ہی نشانیاں تھیں۔ موتیے کا سوکھا ہوا ہار اور چنبیلی کے عطر کی ایک چھوٹی شیشی۔ ہار کو میں نے کمرے کی کھونٹی پر ٹانگ دیا تھا اور عطر کی شیشی کتابوں والی الماری میں چھپا دی تھی۔ الماری پر تالہ لگا تھا اور میرے کمرے میں چنبیلی کی خوشبو بھری تھی۔

شام کو' میں اکثر دوستوں کے ہمراہ گھومتا گھماتا لاری اڈے تک نکل جاتا اور نیاز بس سروس کے لیے مخصوص کونے میں اس وقت تک ٹھہرا رہتا' جب تک بس آخری پھیرا لگا کر واپس نہ آ جاتی۔ آخری پھیرے پر بس سے اترتے ہوئے کریم استاد گاؤں کی خیرخبر بتاتا اور میں

دوستوں کے ساتھ چپ چاپ بورڈنگ ہاؤس کی سمت چل پڑتا۔

شہر پھر شہر تھا' ایک ہنگامہ تھا۔

دن گزر رہے تھے اور شہر کے ہنگاموں نے کوکی کی یاد کو دھندلانا شروع کر دیا تھا۔ البتہ سرشام دوستوں کے ہمراہ لاری اڈے تک نکل جانا اور آخری بس دیکھ کر پلٹ آنا اب جیسے ایک عادت سی بن گئی تھی۔

ایک دن کریم استاد نے بس سے اترتے ہوئے' مجھے الگ لے جا کر بتایا کہ کوکی نے اپنے خاوند کو چھری مار دی ہے' وہ بچ تو گیا ہے لیکن کوکی کے ہاتھوں اور پیروں میں رسی ڈال کر پابند کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر ایک لحظہ کے لیے اس کی یاد نے سینے میں کروٹ لی لیکن اگلے روز امتحانات کا شیڈول ملنے پر میں سب کچھ بھول بھال کر اپنی کتابوں میں کھو گیا۔ یہ دھیان ہی نہ رہا کہ ان کتابوں کے پیچھے ایک چھوٹی سی عطر کی شیشی کبھی سنبھال کر رکھی تھی۔

امتحانات کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ملنے والی تھیں اور ابی کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ انہی چھٹیوں میں میری بہن کی شادی کی تاریخ طے پائی ہے۔ ابی نے مجھے شادی سے پندرہ دن پہلے گاؤں پہنچنے کی تاکید کی تھی۔

امتحانات کے ریلے نے ساحل پر اسارے گئے سارے گھروندے جیسے مسمار کر دیئے تھے اور میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ چھٹیاں ملیں تو کپڑوں اور کتابوں سے بھری اٹیچی کے ساتھ نیاز بس سروس تک چل کر آتے ہوئے گاؤں .کے لیے دل میں کچھ زیادہ امنگ نہیں تھی۔ بس ایک ہلکی سی خجالت کا احساس تھا' کوکی کے لیے ہمدردی یا رحم کا ایک معمولی سا جذبہ' اور اس کے سوال کچھ نہیں۔

گاؤں پہنچ کر میرا زیادہ تر وقت شادی سے متعلق انتظامات اور حجرے میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں گزر گیا۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ادھر جاتا۔ دوستوں سے جو کچھ سنا' وہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ پھر شادی کا ہنگام شروع ہو گیا۔ مہمانوں کی ریل پیل میں کسی بات کا

ہوش نہ رہا تھا۔

شادی کی رات ڈیوڑھی سے نکل رہا تھا کہ لڑکیوں کا ایک ریلا آیا' جس میں' میں نے اسے آخری بار دیکھا۔ وہ سب سے پیچھے تھی۔ اس نے اپنے سوئے ہوئے بیٹے کو کندھے سے لگا رکھا تھا اور مجھے دیکھ کر ایک لحظہ کے لیے ڈیوڑھی میں ٹھہر گئی تھی۔ پھر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی اور میں بھی ڈیوڑھی میں زیادہ دیر نہیں رکا۔

میری بہن نے مجھے بتایا تھا کہ اس روز کوکی اس کے پاس کچھ دیر کے لیے بیٹھی تھی اور اس نے میرے بارے میں پوچھا بھی تھا۔

اب لڑکیوں سے صرف اتنا سنا ہے کہ اس کے پاس میری پی ہوئی سگرٹوں کے ٹوٹے اب بھی محفوظ ہیں' جو اس نے میرے کمرے سے اٹھائے تھے۔ اسے مجھ سے کوئی گلہ نہیں۔ کہتی ہے' وفا تو بے وفا کے ساتھ ہی کی جاتی ہے۔

جب سب گھر والے سو جاتے ہیں تو وہ سگرٹ کے ٹوٹوں کا ڈبہ نکالتی ہے' ایک ایک ٹوٹے کو ہونٹوں سے لگاتی ہے اور سینت کر رکھ لیتی ہے۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔

میں بھی کبھی چنبیلی کی خوشبو گھر نہیں لایا۔

لیکن یہ موسم کی پہلی برف باری ہے۔ باہر حد نگاہ تک برف جمی ہوئی ہے۔ بیگم' کچن میں ہے' بچے گہری نیند سو رہے ہیں اور گھر میں چنبیلی کی خوشبو ہر طرف بھری ہوئی ہے۔

کارنیوال
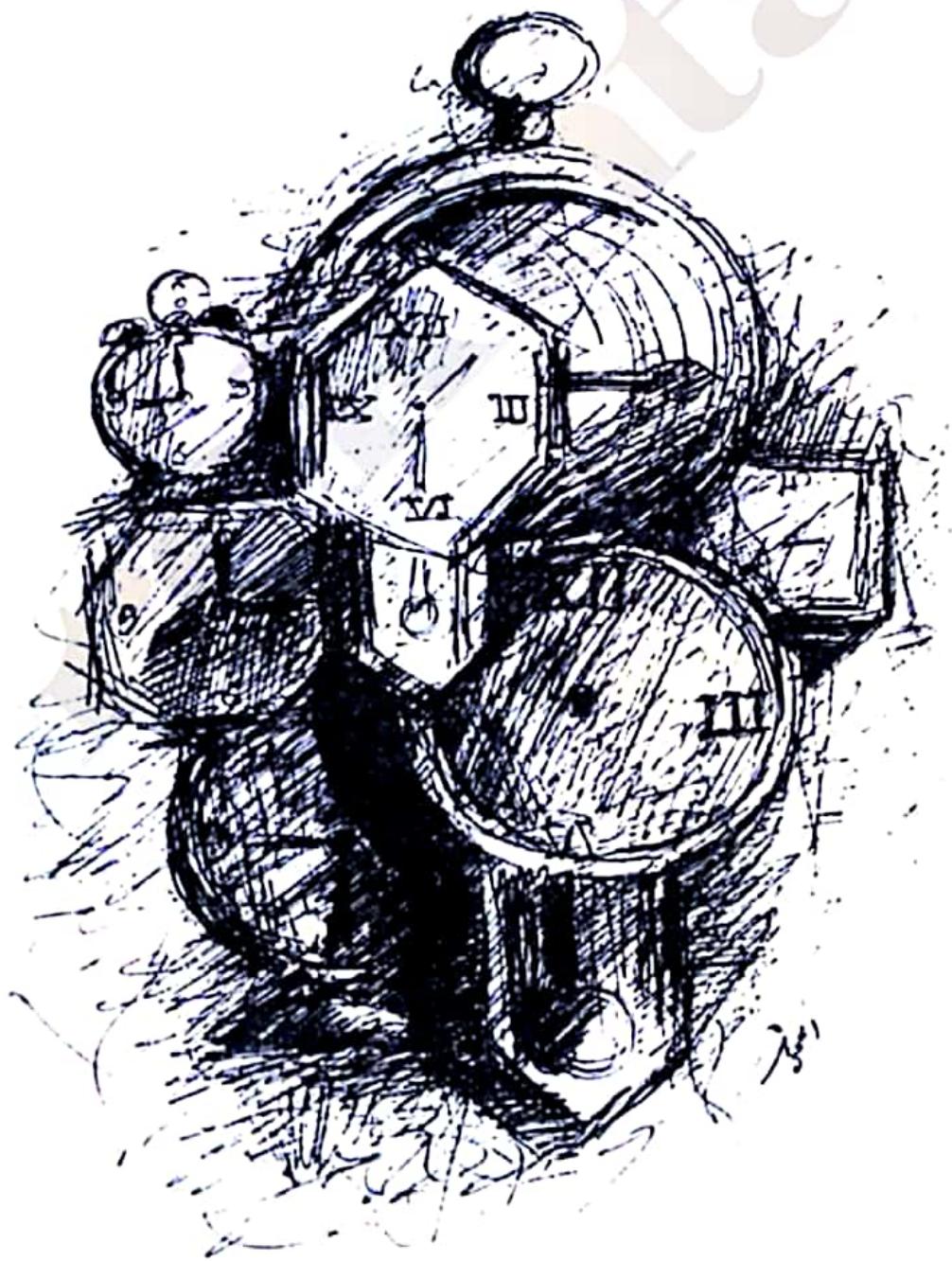
اب وہ شہر کی بھیڑ بھاڑ سے باہر نکل آیا تھا اور اپنے آپ کو خاصا ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔ دفتر سے گھر تک کے راستے میں تانگوں، ٹیکسیوں اور رکشاؤں کی بے ترتیب قطاروں کے شور میں پیدل چلنے والوں اور دوطرفہ دکانوں پر مول تول کرنے والوں کی ہماہمی پیچھے رہ گئی تھی اور وہ اپنے دائیں کندھے پر ذرا سا دباؤ ڈالے، تیز تیز قدم اٹھاتا بس چلا جا رہا تھا۔

آبادی سے دور، کھلے میں نکل جانے والی ہموار پختہ سڑک پر اسے صرف اپنے اٹھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سامنے دور تک کوئی نہیں تھا اور سڑک کے دونوں جانب سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

وہ اپنی دھن میں تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ایک نامانوس سی لے میں گنگنانے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن پھر جلد ہی بے زار ہو کر اپنے ہی قدموں کی چاپ کو سننے میں محو ہو گیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا، کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ ہاتھ اٹھا کر اس اڑن کھٹولے کو رکنے کا اشارا کر دیتا۔ کیا پتا، روک ہی لیتا ــــــــ سب ایک سے تو نہیں ہوتے، پانچوں انگلیاں کب برابر ہوئی ہیں۔ پھر یکایک اسے خیال آیا کہ اس نے بھی تو دیکھا ہو گا، پھر کیوں نہیں رکا۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، اس نے سوچا ہو، راہگیر نے ہاتھ ہی نہیں اٹھایا، تو کیا رکنا۔ سو تیرتا ہوا نکل گیا۔

اس نے انسانی مقدر کے بارے میں سوچا اور یہ کہ سیدھی ہموار سڑک ختم ہونے میں نہیں آتی تھی اور وہ چلا جا رہا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ اتنے بھرے پرے شہر میں سے کسی نے کارنیوال کا رخ ہی نہیں کیا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ وہ الجھتا چلا گیا۔

وہ جب آبادی سے نکلا تھا تو اسی سڑک پر تانگے، ٹیکسیوں کی بھیڑ کی بھیڑ تھی، جو اس طرف رواں تھی۔ تب اس نے سوچا تھا کہ ابھی بہت وقت ہے، شام کے سائے ذرا گہرے ہو جائیں تو کارنیوال میں پہنچنے کا مزا آئے گا، سو وہ پیدل ہی نکل آیا۔

پر اب تک تو اسے وہاں تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس نے یہ سب سوچا تھا اور سامنے نگاہ کی تھی، جہاں سیدھی ہموار سڑک کے دونوں اطراف میں چھتری نما درختوں کی دو رویہ قطاریں، گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے قدموں کی چاپ سنتا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اب خاصا فکرمند دکھائی دے رہا تھا، اور مسافت تھی کہ کسی طور ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔

آخر ماجرا کیا ہے۔ کوئی اور راستہ تو ادھر کو نہیں جاتا۔۔۔ یہاں شک کی کونپل پھوٹی، لیکن وہ اسی شہر میں پلا بڑھا تھا اور اسے تمام راستوں کی خوب پہچان تھی۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو تانگوں اور ٹیکسیوں کی بھیڑ کی بھیڑ کو اسی رخ پر آتے دیکھ کر چلا تھا۔ پھر آخر ہوا کیا؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس نے پلٹ کر نگاہ کی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ بس درختوں کی دو رویہ خاموش قطاریں تھیں، جو گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور وہ اپنے ہی قدموں کی چاپ سن رہا تھا۔

اب آگے بڑھنے کا وہ جوش و خروش نہیں رہ گیا تھا، جو اسے یہاں تک لے آیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ کارنیوال تک کا سفر طے کر آیا تھا، لیکن سڑک تھی کہ کپڑے کے لپٹے ہوئے تھان کی مانند اس کے سامنے کھلتی ہی چلی جا رہی تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی زیرِ تعمیر سڑک پر نکل آیا ہو۔ لیکن یہ ایک مضحکہ خیز خیال تھا، پر اس دنیا کے میلے میں یہ انسانی تماشا کچھ کم مضحکہ خیز ہے، اس نے سوچا:

یہ دنیا کا میلہ بھی عجب ہے' یوں لگتا ہے جیسے کوئی نہ ختم ہونے والا متحرک تصویری فیتہ مسلسل حرکت میں ہے۔۔۔۔۔۔ یا شاید' یہ سب ہونے اور نہ ہونے کا سلسلہ کٹا پھٹا اور ساکت ہے اور یہ جینے کا جتن کرنے والے محض اس تصویری فیتے کے ٹکڑے جوڑنے میں جٹے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ جوڑتے چلے جا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تصویری فیتہ حرکت میں ہے۔

وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ اب اسے یہ فکر مارے ڈال رہی تھی کہ وہ چل بھی رہا ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ درختوں کی یہ بظاہر ساکت قطاریں خاموشی سے شہر کی جانب رواں ہوں اور وہ ویران راستے کے بیچ ساکت کھڑا ہو۔ اس نے گھبرا کر اوپر نگاہ کی۔

آسمان کا طشت روشن ستاروں سے پٹا پڑا تھا۔

ان لامتناہی وسعتوں میں یہ ستاروں کی بارات بھی خوب ہے۔ اس نے خیال کیا:

ماضی میں ہزاروں سال پہلے جو ستارے جل بجھ کر نیست و نابود ہو چکے' وہ انہیں اپنی نظروں میں سمیٹ نہیں پا رہا تھا۔ اب ان حالوں' اس کے لیے واپسی کا سفر ناممکن ہو گیا تھا اور وہ گہری فکر میں غلطاں خاصے تھکے تھکے قدم اٹھا رہا تھا۔

پھر یکایک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں کی چاپ میں نہایت آہستگی کے ساتھ کسی اور راہ گیر کے قدموں کی آواز بھی شامل ہو گئی ہے۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟

اس تاریکی میں ڈوبی ہوئی سنسان سڑک پر یہ خیال اسے کیا آیا' سنسنی کی ایک سرد لہر اس کی ہڈیوں کے گودے تک اتر گئی۔

اب اس نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔

کاش وہ ادھر کا رخ ہی نہ کرتا۔۔۔۔۔۔ معمول کی زندگی کیسی ہموار تھی۔ چار بجے دفتر سے نکل کر ساجھے کے تانگے میں دیگر سواریوں کے ساتھ گپ شپ کرتا' محض چند منٹوں میں وہ اپنی گلی والی نکڑ پر اتر جایا کرتا تھا۔ گھڑی دو گھڑی میں گھر کے سودا سلف کا بندوبست' اور ہر طرح

کا اطمینان۔ جیتے جاگتے لوگوں کی ہاہمی اور بازار کا ہنگامہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اسے یہ سب شدت سے یاد آ رہا تھا اور اس کے نہایت بے دلی سے اٹھتے ہوئے قدم' نامحسوس طور پر جیسے ٹھہرتے چلے جا رہے تھے۔

دوسرے قدموں کی چاپ' اب اس کے بہت قریب پہنچ گئی تھی۔ وہ رک کر چوکنا ہو گیا۔ پھر اس نے سامنے ساکت تاریکی میں تحرک محسوس کیا۔

وہ' کوئی راہ گیر ہی تھا' اور اپنی ذات میں مست تھا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ یہ رکا رہا اور وہ مزے مزے سے جھومتا جھامتا گزرتا چلا گیا۔ ایسے میں اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا' اور چل پڑا تھا لیکن چند ہی قدم چل کر اب اس راہ گیر کا ڈوبتا سنبھلتا وجود ٹھہر گیا تھا اور اس نے راہنمائی چاہی تھی:

"بھائی صاحب ـ ـ ـ ـ ـ ـ شہر کو یہی راستہ جاتا ہے نا؟ ادھر کارنیوال میں ہنگامہ بہت ہے۔"

"جی' جی ہاں ـ ـ ـ ـ ـ یہی راستہ۔ سیدھے چلتے جایئے۔"

اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ راستہ کارنیوال کو ہی جاتا ہے۔

کارنیوال میں ہنگامہ بہت ہے تو یہ یہاں کرنے کیا آیا تھا؟

ایک نئے خروش کے ساتھ' اس نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سوچا۔

وہ شام بھی عجیب تھی اور وہ شخص بھی' جو کارنیوال میں آیا اور ہنگامے سے بھاگتا تھا۔

یہ راستہ کارنیوال کو جاتا بھی ہے؟

وہ ایک بار پھر شک و شبہ کا شکار ہو چلا تھا۔ پر اس نے تانگوں اور ٹیکسیوں کی بھیڑ کی کو اسی رخ پر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر سب کے سب آخر گئے کہاں؟ حیرت ہے۔ انہی تفکرات میں ڈوبا' وہ تیز تیز چلا جا رہا تھا۔

اس اپنے آپ میں مست راہ گیر نے' جہاں اسے الجھا کر رکھ دیا تھا' وہیں اسے آگے

بڑھنے کا حوصلہ بھی دیا تھا' اور وہ سوچ رہا تھا کہ چلو اچھا ہوا وہ شہر کی جانب لوٹ نہیں گیا۔ وہاں بھی کیا ہو گا۔

گلی کی نکڑ پر ہمیشہ کا اونگھتا ہوا گھڑی ساز اپنی دکان پر ابھی جاگ رہا ہو گا' اور جھکا ہوا ہو گا' گئے زمانوں پر۔ یا شاید دکان بڑھا چکا ہو اور گہری نیند سو بھی چکا ہو۔ پر اس کی میز کے اوپر پرانا ویسٹ اینڈ واچ کا گھڑیال مسلسل اپنی ہڈیاں چٹخا رہا ہو گا۔۔۔۔۔ اور ایک تسلسل میں اس کی کریہہ الصوت چنگھاڑ۔ جب وہ ساٹھ منٹ گزر جانے کا اعلان کرتا ہے۔ اب تک تو انتظار کرتے کرتے چھوٹا منو بھی سو چکا ہو گا۔

اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔

چلو اچھا ہی ہوا' لیکن اگر وہ ساتھ بھی ہوتا تو اس اکتا دینے والے سفر میں سو ہی جاتا۔

حد نگاہ تک درختوں کی دو رویہ قطاریں گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں' اور وہ انہی خیالوں میں غلطاں' چلتا گیا۔ حتیٰ کہ تاریکی میں ٹھہری ہوئی تاریکی سے جا ٹکرایا۔

"آؤ بھئی۔۔۔۔۔ کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں' کہاں رہ گئے تھے؟ کارنیوال تک جاؤ گے کیا؟"

یہ وہی اڑن کھٹولہ کار والا تھا۔ اس نے اسے پہچان لیا۔

"جی۔۔۔۔۔ جانا تو تھا۔"

"تو آیئے' چلتے ہیں۔ ایک سے دو اچھے۔ دراصل راستہ بہت خطرناک ہے' اور یہ درختوں کی قطاریں' جھنڈ کا جھنڈ ہے' ختم ہونے میں نہیں آتا۔"

اچک کر سٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی:

"۔۔۔۔۔ یہ یکایک کار کی ہیڈ لائٹس کو جانے کیا ہو گیا۔ تم تو جانتے ہی ہو' میلوں ٹھیلوں کا سفر اکیلے آدمی کا کام نہیں' سنگی ساتھیوں کے ساتھ آنا چاہیے۔"

وہ اڑن کھٹولہ' اس ہموار سڑک پر ایک آدھ بار ہی جھٹکے کے ساتھ اوپر تلے ہوا ہو گا'

کہ اس کی ادھ کھلی آنکھیں یکایک تیز روشنیوں سے خیرہ ہو گئیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں آپس میں گتھی ہوئی تھیں' کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ٹھہرے ہوئے تانگوں اور ٹیکسیوں کی قطاروں میں ہنسی ٹھٹھا کرتے لوگوں کی بھیڑ تھی' جس میں وہ دونوں بھی اتر گئے۔

حد نظر تک دھول مٹی میں اٹے ہوئے لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا' کندھوں پر ہمکتے ہوئے اور انگلی تھامے' ضد کرتے ہوئے بچے اس ہنگامے میں اپنے آپ کو کھوئے ہوئے تھے۔

الٰہی' یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ لوگ' یہاں تک کس راستے سے پہنچے۔

اس نے اپنے ساتھی' اڑن کھٹولہ کار والے سے پوچھنا چاہا' لیکن وہ خود اپنی جگہ حیران دکھائی دے رہا تھا اور اس نے اپنے کندھے سے کندھا جوڑے ایک دیہاتی نوجوان سے پوچھ بھی لیا تھا:

"بھائی صاحب۔۔۔۔ کوئی اور راستہ بھی ہے' اس طرف آنے کا؟"

جواب میں اس نوجوان نے حیران ہو کر ان دونوں کی جانب نظر بھر کر دیکھا تھا اور سامنے کے اٹھتے گرتے انسانی سروں کے سمندر میں غوطہ لگا گیا تھا اور عین وہی لمحہ تھا جب یہ دونوں اس بڑے ہجوم میں تنکے کی مانند ڈولتے' اوپر کو اٹھی ہوئی لکڑی کی سیڑھیوں سے جا ٹکرائے تھے۔ ان سیڑھیوں سے اوپر کو نکل جانے والے انسانی ریلے کا رخ موت کے کنوئیں کی منڈیر تک تھا۔ کنوئیں کے تختے لرز رہے تھے اور اس کے اندر دائرہ در دائرہ چنگھاڑتی ہوئی موت کی لپک جھپک جاری تھی۔

اس کے ساتھی نے اس کے کان میں چلا کر کچھ کہا' اور اس کا بازو تھامے ایک طرف نکل گیا۔ پھر اس اٹھتے گرتے ہجوم کے کہیں درمیان ہی' ڈولتے ہوئے تختے کی بینچ پر دونوں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے۔

"اے لڑکے!"

اڑن کھٹولہ کار والے نے دکاندار کی توجہ چاہی۔

"دو بوتلیں ـــــ ذرا ٹھنڈی ہوں۔"

پلک جھپکتے میں ایک مدقوق سا سولہ سترہ برس کا لڑکا ان کے سامنے بوتلیں رکھ کر یہ جا وہ جا۔ ابھی اس نے بوتل سے مونہہ نہیں لگایا تھا کہ اس کے ساتھی نے ارادہ بدل دیا:

"کیوں نہ چائے پی جائے؟"

"جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے جواب میں کہا۔

"اے لڑکے ـــــ یہ بوتلیں اٹھا لو ـــــ ہمیں چائے دے دو۔"

دکاندار نے خشمگیں نظروں سے دونوں کو تاکا' اور ہاتھ کے اشارے سے اس مدقوق سے لڑکے کو ادھر متوجہ کر دیا۔

اب ان کے سامنے گرم چائے کی دو پیالیاں دھری تھیں۔

"ٹکٹ کھل گئے جی ـــــ قدرت کا کرشمہ دیکھو' عورت ذات گلنار بیگم کا آدھا دھڑ لومڑی کا دیکھو ـــــ ٹکٹ کھل گئے جی۔"

دونوں کی نظریں بیک وقت ایک چھوٹی سی چھولداری کی جانب اٹھ گئیں' جہاں سے لاؤڈ اسپیکر پر ٹکٹ جاری ہو جانے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔

"کیا خیال ہے' دیکھیں؟"

اڑن کھٹولہ کار والے نے ایک ہی سانس میں چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے مشورہ چاہا۔

"ہو گا کیا؟ سب نظروں کا دھوکا ہے' پر تم کہتے تو چلو۔"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور آواز کے رخ پر چل پڑے۔

"اے باؤ جی ـــــ چائے کے پیسے کون دے گا؟" اس مدقوق سے لڑکے نے لپک کر دونوں کے کندھوں کو تھپتھپایا۔

وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے ابھی ٹھٹک کر رکا ہی تھا کہ اڑن کھٹولہ کار والے نے ایک

جھٹکے کے ساتھ اس لڑکے کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔

"کون سے پیسے؟"

"باؤ جی' چائے کے—— اور کون سے——" لڑکا منمنایا۔

"ارے بیوقوف' چائے تو ہم نے بوتلوں کے بدلے منگوائی تھی۔"

"لیکن باؤ جی—— پھر بوتلوں کے پیسے؟"

"ارے پاگل—— سمجھتا کیوں نہیں—— کیا بوتلیں واپس نہیں کر دی تھیں؟"

اسے اپنے ساتھی کی منطق سمجھ میں نہیں آئی۔ دوکاندار اوپر تھڑے پر بیٹھے بیٹھے کب تک سر کھپاتا' آخر چپ ہو رہا۔ دونوں وہاں سے نکل آئے۔ جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

اڑن کھٹولہ کار والے نے اس کے کان میں چیخ کر کہا:

"میلہ' ٹھیلہ ہے۔"

دور کوئی کہہ رہا تھا:

"پاگل ہیں سالے' جانے کہاں سے آ ٹپکے ہیں۔"

کون پاگل ہیں؟

چائے کے کھوکھے کے گرداگرد' لوگوں کے نئے ٹھٹ نے اپنے اپنے طور پر سوچا۔

"ٹکٹ کھل گئے جی—— آدھا دھڑ لومڑی کا دیکھو۔"

بظاہر وہ دونوں آواز کے رخ پر کشاں کشاں چلے جا رہے تھے' لیکن وہ صلح جو قسم کا آدمی تھا اور سدا کا بھلا مانس۔ وہ کسی اور الجھیڑے میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔ اس گرد و غبار کے طوفان میں اور بے محابہ ہجوم میں اس نے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس کیا اور لوگوں کے ایک بڑے ریلے میں سے گزرتے ہوئے وہ اپنا بازو چھڑا کر ایک طرف سٹک گیا۔ اس کے ساتھی' اڑن کھٹولہ کار والے نے' لانا" اسے آوازیں بھی دی ہوں گی لیکن شور بہت تھا اور اب اس کا رخ باہر کی

جانب تھا۔

یکایک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کارنیوال کا ہنگامہ بڑھتے بڑھتے ہر طرف بھر گیا ہے۔

یہ دنیا کا میلہ بھی عجب ہے۔ اس نے سوچا اور اوپر نگاہ کی۔

آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں ہزاروں سال پہلے کے جل بجھے ستاروں کی بارات چڑھی آتی تھی۔

بڑے پنڈال کے باہر تختوں پر گراما فون کی آواز سے آواز ملاتے اور فحش حرکات کرتے خواجہ سرا اس کی توجہ کو ملتفت نہ کر سکے۔ اس نے آسام کے بکرے، آسٹریلیا کے بندر اور مختصر سے پنجرے میں بند زندگی کی سانسیں گنتے ہوئے ببرشیر کو بچپن میں دیکھا ہوا تھا۔ سٹہ بازی سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی۔۔۔۔ توبہ توبہ، وہ کہاں آگیا ہے۔ اس کا دل اوبھ گیا۔

ورائٹی پروگرام والوں کا شور کسکارا اسے پکارتا رہ گیا اور میجک شو شروع ہونے سے پہلے ناچنے والی لڑکیوں کے تھرکتے ہوئے اجسام اسے آوازیں دیتے رہ گئے۔

کارنیوال کے احاطے سے باہر نکلنے سے پہلے جب اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا تو اس وقت جان بہادر سرکس کے اونچے شامیانے کے چاروں اطراف میں سے لوگ تنی ہوئی قناتیں اٹھا اٹھا کر بغیر ٹکٹ اندر گھس رہے تھے اور اس ہڑبونگ میں بڑے اور بچے سب شامل تھے۔ کندھوں پر روشنیوں کی جانب ہمکتے ہوئے بچوں کو تھامے ہوئے بڑے، اور انگلیوں کو چھوڑ کر قناتیں الٹتے ہوئے بچے۔

"قدرت کا کرشمہ دیکھو۔۔۔۔ عورت ذات گلنار بیگم کا آدھا دھڑ لومڑی کا دیکھو۔"

ٹکٹ دوبارہ کھل گئے تھے۔ لیکن اس نے سب آوازوں کو سنا ان سنا کر دیا اور اس ہنگام سے دور نکل آیا۔

۔۔۔۔۔ سب نظروں کا دھوکہ ہے۔ وہ بڑبڑایا۔

جانے کیسے، وہ لشتم پشتم ایک تیار تانگے تک چل کر آگیا تھا۔ اور جانے کب تانگہ اسی

ہموار سڑک پر شہر کی جانب چل نکلا تھا۔ وہ ہنسی ٹھٹھا کرتی دیگر سواریوں سے خائف' دم سادھے خاموش بیٹھا رہا تھا۔

شہر پہنچ کر جب وہ اسٹینڈ پر اترا ہے تو تانگوں اور ٹیکسیوں کی ویسی ہی بھیڑ کی بھیڑ تھی جو کارنیوال کی طرف جانے کو تیار کھڑی تھی۔

وہ اپنے گھر کو جانے والی سڑک پر مڑا تو جیسے اس کی جان میں جان آئی۔ کتنا پرسکون تھا یہ علاقہ۔ گلی کی نکڑ پر گھڑی ساز کی دکان ابھی تک روشن تھی۔ بوڑھا گھڑی ساز اسے آج تک سخت ناپسند رہا تھا اور اسے آج گھر پہنچتے دیر بھی بہت ہو گئی تھی' لیکن پھر بھی وہ دکان کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ بوڑھا گھڑی ساز بیتے زمانوں پر جھکا ہوا تھا' لیکن اس سے بے خبر بھی نہیں تھا۔ اس نے فوراً مڑ کر دیکھا۔

"چاچا——— کام میں برکت ہو۔ آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

"بسم اللہ——— آج بڑی دیر سے واپسی ہوئی۔ میں بس آپ ہی کے آنے کا منتظر تھا۔ بابو جی' خیر تو ہے؟"

"بس چاچا——— ذرا کارنیوال کی طرف نکل گیا تھا۔ لیکن ادھر ہنگامہ بہت ہے۔"

"بابو جی——— کارنیوال ہے' ہنگامہ تو ہو گا۔ اپنے ساتھ منو کو لے جاتے۔"

"ہاں' واقعی۔"

اس نے جواب میں کہا اور تیزی سے گھر کی جانب مڑتے ہوئے سوچا:

——— یہ سب جانتا ہے' میں کب گھر لوٹتا ہوں۔ منو سے بھی واقف ہے' پھر تو اسے یہ بھی پتا ہو گا کہ میں اس سے شدید نفرت کرتا رہا ہوں اور اس کی پرانی ویسٹ اینڈ واچ کی آواز مجھے بری لگتی ہے۔

اس نے یہ سب سوچتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔

جب اس کی بیوی نے دروازہ کھولا ہے تو وہ خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"آج کہاں رہ گئے تھے؟ منو آپ کا انتظار کرتے کرتے ابھی ابھی سویا ہے۔"

"دفتر سے چھٹی ہوئی ہے تو بس کچھ نہ پوچھو۔ ذرا کارنیوال کی طرف نکل گیا تھا۔ لیکن یقین مانو یہ اکیلے آدمی کا کام نہیں۔ میری تو سانس اکھڑنے لگی تھی۔ ایسے میں بچوں کا ساتھ بہت ضروری ہے۔"

وہ جب کمر سیدھی کرنے کو بستر پر لیٹا ہے تو گلی کی نکڑ پر ویسٹ اینڈ واچ نے رات کے گیارہ بجائے تھے۔ اس کی بیوی کچن میں کھانا گرم کر رہی تھی اور وہ اپنے سوئے ہوئے بیٹے کے برابر میں بستر پر اونگھ گیا تھا۔

ملاقات

یہ ایک صبح کا قصہ ہے، جب وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

رات نے جاتے جاتے انتہائی دھیرج کے ساتھ اس پر سے اپنی تاریک چادر سمیٹنا چاہی تو اس نے جھری جھری لی اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔

وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس کی آنکھ لگی تھی۔ اس کی بوجھل پلکوں سے نیند کا خمار اٹھائے نہ اٹھتا تھا، پھر بھی اس نے لیٹے لیٹے بڑے جتن سے بستر پر کروٹ بدلی۔ اس کی پائنتی کی طرف کھلنے والی اکلوتی کھڑکی سے، صبح کے ماند پڑتے ہوئے تارے نے جاتے جاتے اپنی بوجھل پلکیں جھپکیں تو لحظہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں بھی نیند کا غبار چھا گیا اور وہ اونگھ گیا۔ لیکن پھر یکایک اسے یوں لگا جیسے کوئی ہے۔

اس سرد اور ویران کمرے میں کسی کے ہونے کا احساس نیا نیا تھا، وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف نگاہ کی۔

وہاں کوئی بھی تو نہیں تھا۔

اب وہ پوری طرح جاگ گیا تھا۔ پھر بھی وہ تقریباً لڑکھڑاتا ہوا کھڑکی تک چل کر گیا اور لکڑی کے چوکھٹے کو مضبوط ہاتھوں سے تھام کر باہر کی جانب جھک گیا۔ باہر کھلے میں، اس نے ہر طرف نگاہ کی، جہاں ملگجے اندھیرے اور ہلکی ہلکی خنکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ دیر تک یونہی کھڑا

رہا۔ وہ اپنے سرد اور ویران کمرے میں ایک عرصے سے تنہا تھا اور اپنے کام میں مگن۔

باہر کھلے میں قطار اندر قطار کھڑے درختوں میں ہوا رکی ہوئی تھی اور دور دور تک کسی ذی نفس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لیکن ایسے میں اسے یقین سا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے' اس کے آس پاس کوئی تھا۔

یہ کون تھا' جو اس کے اردگرد منڈلا رہا تھا؟

اس نے ذھن پر بہت زور دیا لیکن سوائے کسی ذی نفس کی موجودگی کے احساس کے وہ کچھ بھی نہ جان پایا۔

دن روشن ہوتا گیا اور ایک ایک کر کے اس کے سامنے درختوں کی دو رویہ قطاروں میں سے گزرتی' ہوئی پھول چننے والوں کی ہنستی بولتی ٹکڑیاں آبادی کی طرف پلٹ گئیں۔ وہ تھک ہار کر کھڑکی سے ہٹ آیا اور بغیر ناشتہ کیے اپنے کام میں جٹ گیا۔

وہ دن بھی غیرمتوقع طور پر بہت مصروف گزرا اور وہ رات گئے تک الجھا رہا۔ جب تھک کر سونے کے لیے لیٹا تو صبح کے واقعہ کو وہ پوری طرح بھول چکا تھا۔

لیکن اگلے روز پھر وہی ہوا۔ پو پھٹے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کی پلکیں بوجھل تھیں' پر اسی لمحے اسے یوں لگا جیسے کوئی ہے۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف نگاہ کی' کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا' پر کوئی بھی تو نہیں تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑکی تک آیا اور پھول چننے والے لڑکے لڑکیوں کی واپسی تک وہیں ٹھہرا رہا۔ تاوقتیکہ پھولوں کے گلدستے تھامے اور آپس میں چہلیں کرتے وہ سب گزر گئے۔ کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی اس سرد اور ویران کمرے کی طرف نہیں دیکھا۔ سب اپنی اپنی دھن میں تھے' گزر گئے۔

آج اسے یہ احساس کل سے کہیں زیادہ تھا کہ اس کے آس پاس کوئی ہے۔ کوئی ذی نفس' جو اس کی طرف بڑھنے کا جتن کر رہا ہے۔

اس نے اپنے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا' ہر چیز الٹ پلٹ ڈالی۔ باہر کھلنے والا دروازہ بند تھا اور چٹخنی لگی تھی۔ کھڑکی البتہ کھلی تھی' لیکن وہ باہر کی سمت سطح زمین سے خاصی بلندی پر تھی۔ پھر کسی کو کیا پڑی تھی کہ کھڑکی کے راستے اس کے کمرے تک آتا۔ اس نے اس خیال کو اپنا واہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا اور کام میں لگ گیا۔

اس کا یہ دن بھی بہت مصروف گزرا۔ رات گئے جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو صبح کا واقعہ اسے اچھی طرح یاد تھا لیکن گزشتہ کئی روز کی بے خوابی کے سبب وہ جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

اگلے روز پھر وہی کچھ ہوا۔

وہ جب چونک کر جاگا تو سب سے پہلے اس کا دھیان کھڑکی کی طرف گیا۔ آج وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح تھا۔ آج اسے یقین سا تھا کہ واقعی کوئی ہے' جو رہ رہ کر اس کی طرف بڑھنے کا جتن کر رہا ہے۔ لیکن جب وہ جاگ اٹھتا ہے تو وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے دور ہٹ جاتا ہے اور اپنا کوئی پتا نشان چھوڑ کر نہیں جاتا۔

اس نے اٹھ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ جہاں گہرائی میں دیوار کے ساتھ رات کی رانی کا مہکتا ہوا جھاڑ خاموش کھڑا تھا۔ وہ سخت حیران ہوا کہ اتنے عرصے تک وہ اتنے خوشبودار پودے کی وہاں موجودگی سے بے خبر رہا۔ اس کی مصروفیت ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ دن بھر اپنے کام میں جتا رہتا اور رات گئے تھک ہار کر سو رہتا۔

وہ کھڑکی سے باہر کے منظر کو تکتے تکتے جب اکتا گیا تو پیچھے ہٹ آیا۔ عین اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔

اب اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ جیسے کوئی آتا ہے اور اس کی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے پلٹ جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ دروازے پر دستک بھی دیتا ہو اور وہ اپنے کام میں انہاک کے سبب نہ سن سکتا ہو۔ اس نے سوچا۔

سو' اس نے فیصلہ کیا کہ صرف ایک روز وہ اپنے معمول سے ہٹ کر دن گزارے گا اور باہر کا دھیان رکھے گا اور یہ کہ گزشتہ کئی راتوں سے وہ مسلسل جاگ رہا تھا اور اس روز اس نے وقت پر سو جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

کچھ یہی سبب ہے کہ آج ایک مدت بعد اس نے ٹھکانے کا ناشتہ کیا اور دیر تک چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتا رہا۔

اس کے سامنے میز پر رکھے طشت میں بھیگے ہوئے رنگ ابھی نہیں سوکھے تھے۔ کمرے میں آئل پینٹ کی بو مدھم پڑ چکی تھی اور چھوٹی بڑی تپائیوں پر ادھ خالی اور بھرے ہوئے رنگوں کے ڈبے بے ترتیبی کے ساتھ پڑے تھے۔ آج اس نے برش کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور کینوس کو اسی طرح ڈھکا رہنے دیا۔

آج اس نے اپنے معمول سے ہٹ کر دن گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے آج اسے کام کی کوئی فکر نہیں تھی۔ کیوں نہ کمرے میں پڑی اشیاء کی ترتیب بدل دی جائے۔ اس نے سوچا۔

وہ اس یکسانیت کے احساس ہی کو ختم کر دینا چاہتا تھا پر کیا کرتا' ایک دن میں یہ سب ممکن نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی تک چلا آیا۔ باہر کا منظر اس کا دیکھا بھالا تھا۔ وہی درختوں کی دور تک نکل گئی دو رویہ قطار اور گہرا سکوت۔

دوپہر دن تک اس سے ملنے کوئی نہ آیا اور وہ یونہی بیکار اپنے بیتے دنوں کی یادوں میں کھویا رہا۔

کبھی اس سرد اور ویران کمرے میں وہ تنہا نہیں تھا۔ ایک شفقت بھرے وجود کا ہر دم ساتھ تھا۔۔۔۔۔ وہ بچپن کے دن جب سامنے کے درختوں میں وہ دن بھر اپنے آپ کو کھویا رہتا اور جب تھک ہار کر سونے لگتا تو ماں اپنے سر کی اوڑھنی سے اس کا چہرہ ڈھانپ دیتی۔ ایسے میں اس شفقت بھرے وجود کی خوشبو اور لوریوں کے ہلارے اس کے مضمحل وجود میں گرتے رہتے وہ

اونگھتا رہتا اور وہ نیک بخت ہواؤں سے باتیں کرتی رہتی۔۔۔۔۔۔ کبھی کہتی' اے ہواؤ! جاؤ اور اسے کہنا کہ کبھی آئے اور صورت دکھا جائے۔ لیکن ہوائیں تھیں کہ داد فریاد سے بے پروا بس گزرتی رہتیں۔

جانے والا کیسے آتا۔۔۔۔۔ لام لگی ہوئی تھی اور دھرتی کے چاروں اطراف میں گھمسان کا رن پڑا تھا۔

وہ نیند کی وادیوں سے گرتا سنبھلتا' اس جا کر نہ آنے والے کو ڈھونڈتا پھرتا' لڑائی کے میدانوں میں نکل جاتا اور دھول مٹی سے اٹے ہوئے چہروں میں اسے کھوجنے کا جتن کرتا۔ جاگ اٹھنے پر جب وہ اپنے الجھے ہوئے خوابوں کی ڈور سلجھاتا تو اس نیک بخت کے چہرے پر رونق آ جاتی اور وہ اسے اپنی کمر پر اٹھائے اٹھائے لوگوں سے خوابوں کی تعبیریں پوچھتی پھرتی۔۔۔۔۔۔ وہ ہواؤں سے باتیں کرتی تھی اور ہنستے ہنستے رو رو پڑتی تھی۔

یہ ہوائیں بھی کیا ہیں؟ اس نے خیال کیا۔

سارے زمانے کی تنہائیاں' محبتیں اور نفرتیں اپنے اندر سمیٹے ہر طرف رواں ہیں۔ وہ اپنے خیال کی رو میں بہتا چلا گیا تھا۔

یکلخت اس نے اپنا سر جھٹکا اور کھڑکی سے پیچھے ہٹ آیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہر شے اور ہر جذبے کا آخر ایک انت ہے اور یہ کہ جانے والا لڑائی کے میدانوں تک واپس پلٹنے کے لیے نہیں گیا تھا۔

اب سہ پہر ہو چلی تھی اور اس سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سارا دن یونہی بیکار بیٹھا رہا تھا اور اس کی طبیعت خاصی بوجھل ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ کچھ دیر کے لیے باہر ہو آئے۔

اس نے سب کچھ ویسے کا ویسا رہنے دیا اور کمرے کو تالا لگا کر باہر نکل آیا۔ وہ کسی بھی سمت نکل جانا چاہتا تھا' سو اپنے اطراف و جوانب سے بے پروا سر جھکائے چلتا رہا۔ وہ جا رہا تھا کہ

یکایک سامنے سے آتے ہوئے ایک سفید بالوں والے رعشہ زدہ وجود نے اسے روک لیا۔ خاکی وردی میں اس کی ڈاڑھی بے طرح بڑھی ہوئی تھی اور اس کی پشت پر سامان بندھا تھا۔ بڈھے نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا:

"کیوں برخوردار ـــــ وہاں ـــــ اس درختوں کے جھنڈ میں ـــــ ایک لشکری رہتا تھا ـــــ اس کی ایک بیوی اور بیٹا بھی تھا ـــــ کیا وہ لوگ اب بھی وہیں ـــــ"

"ہاں وہ لشکری ـــــ جو لام پر گیا ہوا تھا' اسی کو پوچھ رہے ہیں آپ؟" اس نے استفسار کیا۔

"ہاں ہاں ـــــ بیٹے تم بھی یہیں کہیں رہتے ہو؟ تمہارے باپ کا نام ـــــ"

"جی اپنا نام تو بتا سکتا ہوں آپ کو ـــــ باپ کا نام کیا کریں گے پوچھ کر ـــــ یہ چابیاں ہیں' لے جائیے ـــــ وہاں سے پوچھ لیجئے گا۔"

اس نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی چابیاں اس نووارد کو تھما دیں اور اسی طرح سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

آج اس نے اپنے معمول سے ہٹ کر دن گزارنے کا فیصلہ کیا تھا' اس لیے وہ کسی بھی سمت نکل جانا چاہتا تھا اور ہوا سنکی ہوئی تھی۔

نووارد کچھ دیر تک اس سرد اور ویران کمرے کی دہلیز پر ٹھہرا رہا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں دور دور تک کوئی نہ تھا۔ درختوں کی دو رویہ قطاریں خاموش تھیں اور ان میں ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تالا کھولا اور دروازے کو دھکیل کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

اب کمرے میں آئل پینٹ کی بو برائے نام رہ گئی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں اس نے دیکھا کہ ہر طرف کئی پھٹی تصویروں کے انبار لگے تھے۔ چھوٹی بڑی تپائیوں پر ادھ خالی اور بھرے ہوئے

رنگوں کے ڈبے بے ترتیبی کے ساتھ دھرے تھے۔ میز پر دھلے ہوئے برش، رنگوں بھرے طشت کے ساتھ یکجا پڑے تھے اور ڈھکے ہوئے کینوس پر ٹنگی ہوئی تصویر ایک لشکری کی تھی، جو لام کے میدانوں سے منزلیں مارتا ہوا اس سرد اور ویران کمرے تک پہنچا تھا۔
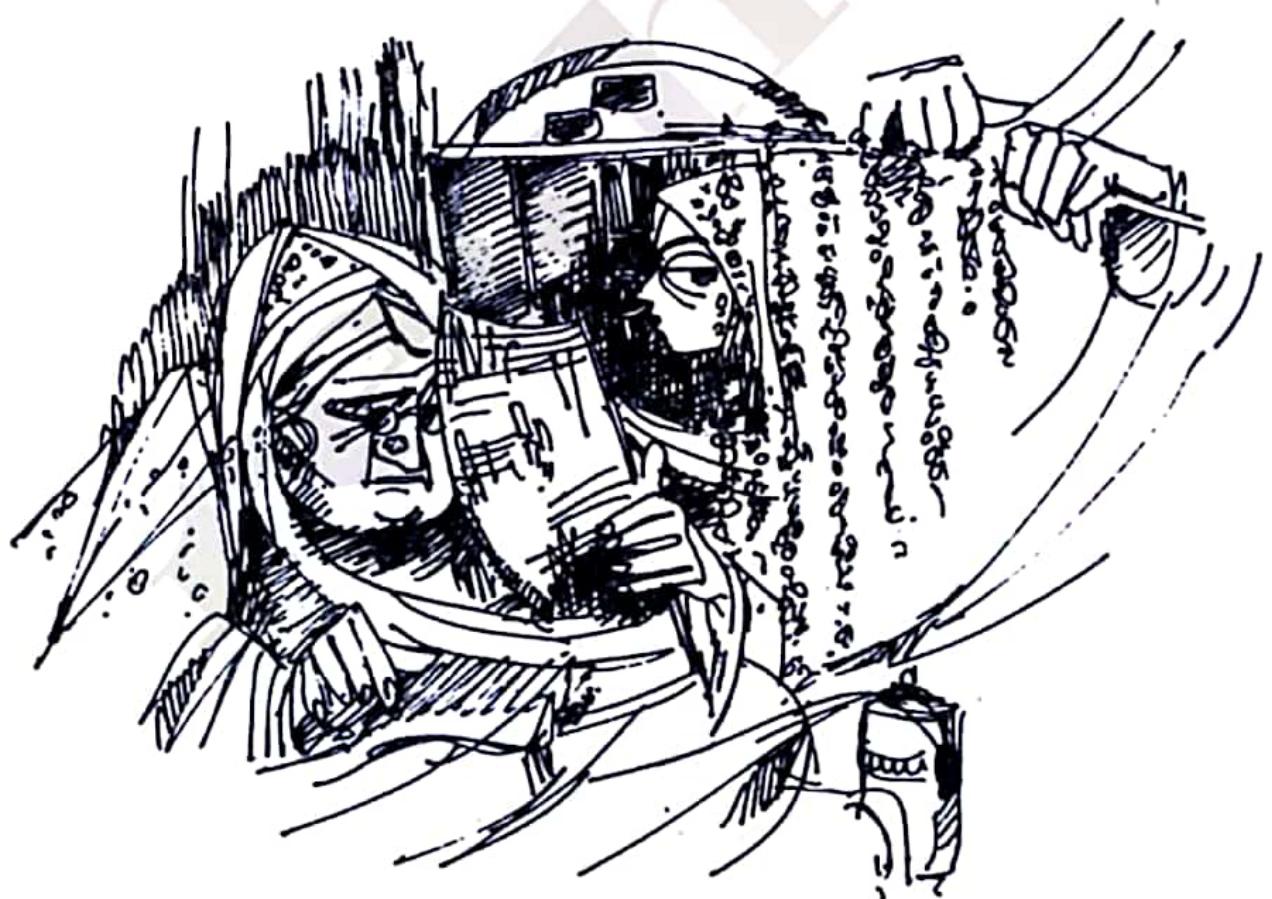
پھول بانٹنے والا

جاڑوں کی آمد آمد تھی اور اس کی کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں تھی۔

ایک نیم غنودگی کی کیفیت تھی جو اس پر ہر دم طاری رہنے لگی۔ وہ جاگتے میں سوتا رہتا اور سوتے میں جاگتا تھا۔

اور وہ دن بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

موسم میں وہ شدت نہیں تھی جو اپنا پابند بنا کر رکھ دیتی ہے۔ وہ دن چڑھے تک سوتا رہتا اور رات گئے تک نیم تاریک خالی سڑکوں پر آوارہ خرامی کرتا۔

وہ اکیلا تھا اور اپنے اکیلے پن میں مگن تھا۔

اس اتنے بڑے شہر میں اس کے جاننے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ مصروف شہر کے کسی بازار میں، کسی دوہری چھت کی بس میں یا رات گئے کسی چائے کے کھوکھے پر کسی دور یا نزدیک کے شناسا سے مٹ بھیڑ ہو گئی ہو۔

اور یہ کہ وہ اس میں خوش تھا۔

لیکن جاڑوں کی آمد آمد تھی۔

اس روز جب شہر کے اس نشیبی علاقے میں وہ اپنی چال کے سامنے بہتے ہوئے گندے نالے کے اوپر انگڑائیاں توڑتی ہوئی چارپائی پر سوتے میں جاگ رہا تھا، تو یکایک ایک جھٹکے کے

ساتھ اٹھ بیٹھا تھا۔

اس وقت تک ساجھے کی چال میں رہنے والے اس کے دیگر ساتھی کام پر جا چکے تھے اور برابر والی کھولی کے سامنے، اس وقت صرف ایک ٹین ڈبے والا آلتی پالتی مارے، بیٹھا ٹین کی کترنیں کوٹ کر یکجا کر رہا تھا۔

دونوں اطراف میں بل کھا کر مڑتی ہوئی گلی میں کوئی بھی تو نہیں تھا۔ کوئی راہگیر، کوئی بھولا بھٹکا مسافر، جو شہر کی اس ترائی میں اتر آیا ہو اور بھٹک گیا ہو۔

کوئی بھی نہیں، یہاں تک کہ سفید چونڈے والی وہ بدحواس بڑھیا بھی نظر نہیں آ رہی تھی جو ہر دم اپنی کھولی کے بند دروازے کے سامنے دہلیز پر اکیلی بیٹھی، ہر آنے جانے والے کو ٹکر ٹکر تکے جاتی ہے، اور بند دروازے کے پیچھے اس کی جوان بہو قید تنہائی کاٹتی ہے۔

——— بڑی بھول ہوئی۔

اس نے اپنی چھاتی کے خشک بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا:

——— کبھی اس بڑھیا سے پوچھنا تو بنتا تھا کہ کیوں اس بند دروازے کے پیچھے اس بیچاری کو قید کر رکھا ہے۔ اسے ہنسنے بولنے کی اجازت کیوں نہیں؟

لیکن اس وقت گلی میں وہ اکیلا تھا۔ ٹین ڈبے والا اپنی کھڑکھڑ کرتی سائیکل پر دونوں اطراف میں جھولتے ہوئے بوجھ کو سنبھالے کب کا جا چکا تھا۔

سورج سر پر ٹھہرا ہوا تھا اور دھوپ میں وہ تمازت نہیں تھی جو اسے اس طرح یکلخت جاگ اٹھنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ اپنے اس طرح جاگ اٹھنے پر وہ خود حیران تھا اور جاڑوں کی آمد آمد تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے نالے کے اوپر بچھی ہوئی بان کی جھلنگا کھاٹ کو وہیں پڑا رہنے دیا اور اپنی کھولی کا نیم وا دروازہ دھکیل کر اندر چلا گیا۔

باہر ہر طرف چپ کی چادر تنی تھی۔

وہ کھولی کے اندر، صبح کا گیا اس وقت باہر نکلا ہے جب شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے لوٹ آنے سے کچھ ہی دیر پہلے اس گلی میں آخری بار دیکھا گیا۔
وہ بہت جلدی میں تھا، اس نے اپنی کھولی کا دروازہ بھیڑ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور نکل آیا۔

وہ خاصا خوش وضع اور وجیہہ نوجوان تھا اور قیمتی لباس اس پر پھبتا بھی تھا لیکن یہ تو گئے وقتوں کی باتیں ہیں، اب تو اس کے کندھے کسی حد تک آگے کو جھک آئے تھے اور اس کی شہابی رنگت قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ لیکن آج گئے زمانے کیسے پلٹ پڑے تھے، سب گلی محلے والے حیران تھے، پر ان میں اتنی ہمت کہاں کہ اس سے کسی بات پر استفسار کرتے۔
اور یہ کہ جاڑوں کی آمد آمد تھی اور ہر لحظہ بڑھتی ہوئی خنک تاریکی میں اس کی منزل کا تعین ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ وہ جلدی میں تھا اور محلے میں اس کی صاحب سلامت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ کسے بتاتا کہ یوں یکایک موسم کی کروٹ کے ساتھ گئے زمانے کیسے لوٹ آتے ہیں۔

وہ نکل آیا اور تب کا گیا نہیں پلٹا۔
مصروف شہر کے اس نشیبی علاقے میں نیم روشن کھولیوں کی قطار کے سامنے بہتے ہوئے نالے کے اوپر انگڑائیاں توڑتی چارپائیوں پر اس کا ذکر چل نکلا۔ کسی نے کہا۔۔۔۔۔ وہ اپنی دھن میں تھا۔ جب یہاں سے نکلا ہے تو وہ چپکے سے اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔ اس کا رخ شہر کے سب سے بارونق حصے کی جانب تھا۔ پھر وہ دونوں جگ مگ کرتے ریستورانوں کی دو رویہ قطاروں تک جا پہنچے۔

اور یہ کہ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر پھول والے سے نرگس کا ایک گلدستہ خریدا اور دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔
بتانے والے نے بتایا کہ اس شام اس نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن جگ مگ کرتے

ریستورانوں کے اندر جھانکنے کا حوصلہ نہیں تھا' کیا کرتا' اسے وہیں کھو آیا۔

سب پر دیر تک سکوت طاری رہا اور پھر سب جیسے دل ہی دل میں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے' کہ خوش وضع جوان تھا اور قیمتی لباس اس پر پھبتا بھی تھا۔ کسی بڑھیا ریستوران میں کوئی نازنین اس کی منتظر ہو گی' پھر اک روز اسے جانا ہی تھا۔ وہ شہزادوں کی طرح ہاتھ میں نرگس کے پھول تھامے پہنچا ہو گا اور سب کی سب ریشم میں ڈوبی بیاہتا عورتیں اور کنواری لڑکیاں دل تھام کر رہ گئی ہوں گی۔ اور پھر جیسا کہ ہوتا ہے' کسی ایک نے اسے ورغلا لیا ہو گا۔

اس آبادی میں ایک وہی تھا۔ پھر ویسا کوئی کیا جنے گی۔

نرگس کے پھول بانٹ کر وہ ضرور لوٹ آئے گا۔ یہ چال اسے بھولنے کی نہیں ہے۔

سب تھکے ماندے وجود نیند کی وادیوں میں اترنے سے پہلے یہی کچھ سوچ رہے تھے۔ اور ادھر شہر کے ایک اور نشیبی علاقے میں' نیم روشن کھولیوں کی قطار میں اس کے یوں یکایک لوٹ کر آ جانے پر ہنگامہ بپا تھا۔ لیکن اب وہ سفید چونڈے والی بدحواس بڑھیا بند دروازے کی دہلیز پر بیٹھنے کو نہیں رہ گئی تھی۔ اسے بیتے تو ایک زمانہ ہو چکا' اور قید تنہائی کاٹنے والی جوانی کے سر میں چاندی اور آنکھوں میں سفیدی اتر آئی تھی۔

وہ حیران تھا کہ اتنی جلدی یہ سب کیسے ممکن ہوا۔

وہ تو بس دن چڑھے تک سوتا رہا تھا اور رات گئے نیم تاریک خالی سڑکوں پر آوارہ خرامی کرتا ذرا دور نکل گیا تھا' نشیبی علاقوں کی جانب۔
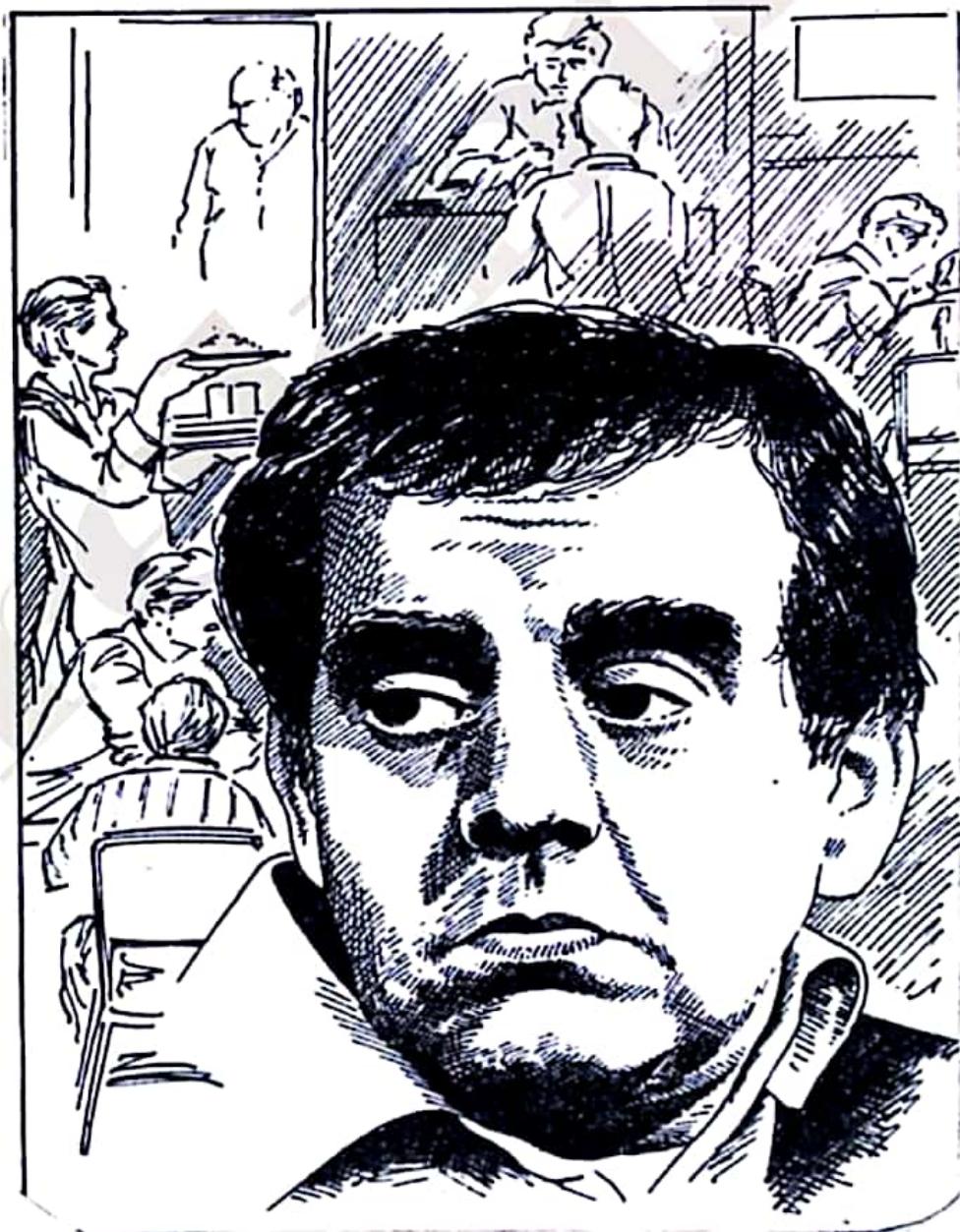
اور یہ کہ جاڑوں کی آمد آمد تھی۔

سب باتوں کی ایک بات، کہ میں نے ادھار لے کر کبھی واپس نہیں کیا۔

میرا خیال تھا کہ قرض لیا ہی اس لیے جاتا ہے کہ واپس نہ کیا جائے۔

میں گزشتہ پانچ برس کی بے کاری کے دوران، اتنا کچھ ادھار لے چکا ہوں کہ لوٹانے پر آؤں تو اگلے پانچ برس بھوکا بیٹھا رہوں۔ لیکن آج، میں ایک سو روپے کا منی آرڈر بھیج کر دو برس قبل کھائے ہوئے کھانے کا بل ادا کرنا چاہتا ہوں۔

صرف ایک بل۔۔۔ جس کا تقاضا کبھی کسی نے نہیں کیا، لیکن جس نے مجھے ہمیشہ اوندھا کیے رکھا ہے۔

اس وقت مجھے اس ہوٹل کا پتا پوری طرح یاد نہیں، لیکن مجھے اس بات کا پوری طرح یقین ہے کہ میرے بھجوائے ہوئے روپے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اسے، جو گم متھان بیٹھا رہتا تھا، بولتا نہیں تھا۔

مجھ جیسا خسیس انسان اس کے پیسے نہیں مار سکا تو کون مائی کا لال ہو گا جو ایسا سوچ سکے۔

دو برس قبل اس شہر کو چھوڑتے وقت، آخری دن ہوٹل کے کاؤنٹر پہ رکھے رجسٹر پر دستخط کرتے ہوئے میں نے اس سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ گھر پہنچتے ہی سارے روپے بھجوا دوں گا،

اور اس نے جواب میں کہا تھا:

"او یارا۔۔۔۔۔ پیسے کہیں نہیں جاتے' لوگ چلے جاتے ہیں۔ بے غم رہو۔ میرے ہوئے تو پہنچ جائیں گے۔"

اور اس وقت میں نے دل ہی دل میں کہا تھا: "تم بھی بے غم رہو۔ میں نے قرض کبھی چکانے کے لیے نہیں لیا۔"

لیکن آج پہلی تنخواہ ملی ہے تو وہ یاد آیا ہے اور خود کو آج پہلی بار میں نے اتنا بے بس پایا ہے۔ میں اس تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی قرض چکانے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا' لیکن کیا کروں' وہ کہہ رہا ہے:

"او یارا۔۔۔۔۔ پیسے کہیں نہیں جاتے۔"

آج تنخواہ وصول کرتے وقت' دستخط کرتے ہوئے' مجھے اس ہوٹل کے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے رجسٹر نے ایک بار پھر اوندھا کر دیا ہے۔ میں اس ہوٹل میں اپنا پہلا دن یاد کرتا ہوں۔

بے کاری کا وہ دن' جب کسی طرف سے بھی پیٹ بھر کر کھانا ملنے کی توقع نہ تھی' اور میں دو دن کا بھوکا' اس شہر کی سوتیلی اولاد' ایک چھوٹی سی بند دکان کے تھڑے پر بیٹھا' اس ہوٹل کے آتے جاتے گاہکوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیسے اور کیا سوچ کر میں بھی اٹھ کر اندر چلا گیا تھا اور پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ کھانے کے بعد چائے پی کر میں بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ بغیر بل چکائے' کاؤنٹر کے قریب سے ہو کر باہر نکل گیا۔

وہ' جو کاؤنٹر پر گم متھان بیٹھا تھا' چپ رہا اور میں پورے سات دن وہاں سے ڈٹ کر کھاتا رہا۔ اس نے پوچھا تک نہیں۔

آخری روز' میں خود ہی کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے پا کر پہلو بدلا اور دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔

"میں گھر پہنچتے ہی سارے روپے بھجوا دوں گا۔"

"او یارا۔۔۔۔ پیسے کہیں نہیں جاتے' لوگ چلے جاتے ہیں۔ بے غم رہو۔ میرے ہوئے تو پہنچ جائیں گے۔"

میں نے یہ قصہ اپنے ایک اور بے روزگار ساتھی کو سنایا تو وہ ہنس دیا۔ کہنے لگا: "میں نے تو جان بوجھ کر تمہیں نہیں بتایا کہ وہ غریب' ناحق مارا جائے گا۔ سچ پوچھو تو میں بھی اکثر پیٹ پوجا' وہیں جا کر کرتا ہوں۔ خدا معلوم' وہ پوچھتا کیوں نہیں۔ لیکن یار' لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنا کھایا پیا جب چاہے رکھوا لے۔"

پھر اس نے مجھے ایک کہانی سنائی' کہ ہوٹل والے کا ایک ہی بیٹا تھا۔ عمر ہو گی کوئی بارہ تیرہ برس۔ بڑا خوبرو۔۔۔۔ وہ گم ہو گیا۔ پورے پندرہ دن بعد شہر کے بند مکان سے ایک لاش ملی۔ شناخت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی کا بیٹا ہے۔

لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا' جس کی زد پر وہ اکیلا' ہر ایک کے چہرے کو تکتا تھا۔ کسی نے بھی اس کی آنکھ سے آنسو گرتے نہیں دیکھا۔ بہت شور کارا ہوا۔ پولیس نے پوچھ گچھ کی۔ اس سے پوچھا گیا کہ کسی پر شک ہو تو بولو۔ وہ کہنے لگا: "میری کسی سے دشمنی نہیں' میں کس پر شک کروں؟"

بات پرانی ہو گی اور لوگ بھول بھال گئے۔

لیکن اس کا وہ نوکر چپ چپ رہنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے سر کے سارے بال سفید ہو گئے اور گاہکوں کو چائے کی پیالیاں تھماتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

ایک دن وہ صبح کام پر نہیں آیا اور شام کے وقت اس کی بند کوٹھڑی کے سامنے لوگوں کا ہجوم بنا گیا۔ اس نے ہوٹل کی ہی چھری سے اپنی گردن اتار لی تھی۔ اس موت کے گواہ محلے ہی کے چھوٹے چھوٹے دو بچے تھے' جن کے سامنے دن کے وقت اس نے اقرار کیا تھا کہ اس کے مالک کے بیٹے کا قاتل وہی ہے۔

اس کہانی کو سنے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ دیکھ کر بتائیں کہ کہیں میرے سر کے بال بھی

سفید تو نہیں ہو گئے۔

میں کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ منی آرڈر لکھتا ہوں۔

اینگلو اِنڈین لڑکی کی کہانی

شام گہری ہوتے ہی سڑک کے دونوں اطراف میں روئی روئی شکلوں والے بجلی کے کھمبے جاگ اٹھے۔ چائے بناتے اور برتن مانجھتے ہوئے ہاتھ اسی چینک میں تھے' اونگھتے رہے اور چھپروں تلے غسیل ہوٹلوں میں شور ککارا کرتے گراما فون کی آوازیں ایک دوسرے کے ساتھ الجھتی رہیں۔

یہاں زندگی اونگھ رہی ہے اور بستی میں سرشام جیسے جن پھر گیا ہے۔

ہر پندرہ بیس منٹ بعد جب شیر شاہ سوری روڈ کی اس نکڑ پر منزلیں مارتی ہوئی ہانپتی کانپتی بس' دم لینے یا مسافر اتارنے چڑھانے کو رکتی ہے تو جیسے گھڑی دو گھڑی کے لیے لاری اڈے کی رونق لوٹ آتی ہے۔ گلفشاں ہوٹل اور بسم اللہ ہوٹل کے دو بھونپو بیرے ہاتھ ہلا ہلا کر مسافروں کو چارپائی بستر کی طرف بلاتے ہیں اور یہ سب گھڑی دو گھڑی کے لیے ہوتا ہے۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہی روتی شکلوں والے کھمبے جاگتے رہ جاتے ہیں یا غسیل ہوٹلوں میں گراما فون کا شور ککارا۔

اس کہانی کے ہیرو کا پورا نام مجھے نہیں معلوم' بس اتنا جانتا ہوں کہ اسے اس بستی اور لاری اڈے پر جہاں تہاں "مرزا۔۔۔ مرزا" پکارا جاتا ہے۔

اس وقت لاری اڈے پر اس کی موجودگی اپنا پتا نہیں دے رہی' لیکن وہ یہیں کہیں ہو گا' کسی چھپر تلے جھلنگا کھاٹ میں جھولتا ہوا یا کسی گراما فون کے سامنے آنکھیں میچے' اپنی پسندیدہ فلمی

دھن پر جھومتا۔

بہت دنوں سے یہ جوان سورج کے ڈوبنے کا نظارہ اس سامنے والے برساتی نالے پر سے کرتا ہے۔

یہاں زندگی کتنی ست گام ہے۔ اس نے کئی بار اس مسئلے پر سوچا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ سامنے ایک بھری پری بس کو بریک لگی ہے۔

"لاہور۔۔۔۔ لاہور۔۔۔۔۔ داتا کی نگری"

کنڈیکٹر نے بس کی چھت پر سے تھوڑا سا سامان نیچے لڑھکاتے ہوئے آواز لگائی۔ ابھی چھابڑی والے بچے مسافروں کو بھنے ہوئے بھٹے ٹھیک طرح دکھا بھی نہ پائے تھے کہ کنڈیکٹر نے لش لش کرتی بس کو تھاپڑا مارا: "چلو استاد"

بس چل دی اور بس کی چھت پر سے لڑھکائے گئے سامان کے گرداگرد ہجوم اکٹھا ہوتا چلا گیا۔ گھیرا تنگ پڑتا گیا' اور ہاں اس کہانی کا ہیرو بھی آخرکار پہنچ ہی گیا۔

اس تنگ پڑتے ہوئے گھیرے میں ایک نوجوان انگریز جوڑا تھا۔ ایک گورا اور ایک گوری۔

رات کا پہلا پہر تھا اور لوگ اس سوچ میں غرق تھے کہ یہ اتنی خوبصورت لڑکی یہاں رات کیوں کر کاٹے گی۔ ایسے میں بسم اللہ ہوٹل کے مالک نے مناسب سمجھا کہ وہ خود انہیں اشاروں کے ساتھ سمجھا دے کہ اس کے اپنے ہوٹل میں صاف ستھرا چارپائی بستر مل سکتا ہے' لیکن ابھی وہ گونگا ہی تھا کہ گلفشاں ہوٹل کے بھونپو بیرے نے درمیان میں پڑا' بکھرا ہوا سامان سمیٹ کر اٹھا لیا اور اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ لوگوں کا ہجوم چہار جانب کھنڈ گیا۔

ہمارے مرزے کو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ گورا لڑکا بالکل انجان مسافر کی طرح بجائے گلفشاں ہوٹل کے بسم اللہ ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ لڑکی نے لحظہ بھر کے لیے رک کر جیسے اس کا انتظار کیا اور پھر اپنے سوکھے لمبے سنہری بالوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ دائیں سے بائیں گرا

کر گلفشاں ہوٹل کی طرف مڑ گئی۔ اس وقت تک بیرا سارا سامان کاؤنٹر کے قریب رکھ چکا تھا۔

گوری، چائے کا آرڈر دے کر اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو اور اشاروں میں بیرے کو کچھ سمجھاتی رہی، ایسے میں غسیل ہوٹلوں کے گراما فون کی آوازیں آپس میں گتھم گتھا رہیں۔ وہ اپنے ساتھی جان کو گلفشاں ہوٹل کی طرف بلانے کو کہہ رہی تھی اور بیرا کچھ نہ سمجھتے ہوئے بتیسی نکالے کھڑا تھا۔

ہمارے مرزے نے آگے بڑھ کر بیرے کو لڑکی کا مدعا سمجھایا اور خالی کرسی کھینچ کر وہیں جم گیا۔ اب وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی، کالے رنگ کی بڑے مردانہ کالروں والی قمیض اور کسی اور پھنسی ہوئی نیلی جین میں سے باہر اڈتی ہوئی گوری۔

مرزے نے اپنی گلابی انگریزی میں اس کے ساتھ گٹ مٹ شروع کی۔

گوری نے بتایا کہ:

وہ اور جان اکٹھے اپنے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ مشرقی فرانس، بلجیم، ہالینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور ترکی سے ہوتے ہوئے افغانستان پہنچے اور کابل میں کسی بات پر دونوں لڑپڑے۔ سو وہ اب تک روٹھا ہوا ہے اور لاہور تک جانے کی بجائے اس اجاڑ مقام پر اتر پڑا ہے۔

گوری کا باپ لندن شہر میں بیوپاری تھا اور اس کی مرحومہ والدہ ایک ہندوستانی خاتون تھی جو اس طرف کے علاقوں کو اکثر یاد کیا کرتی تھی۔ گوری کے بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی دوست تھے، جو اسے خط لکھ لکھ کر ہر ماہ نئے فوٹو کا تقاضا کرتے تھے، جینز میں اور جینز کے بغیر۔۔۔۔ "شرارتی"۔

مرزے کی رال ٹپکنے لگی۔

گوری نے اپنی ہپ پاکٹ سے دو تڑی مڑی سگرٹیں نکالیں اور بولی:

"مرزا! آئی لائیک انڈین پیپل، مینس تم بی"

مرزے کی باچھیں پھیل کر کانوں سے جا لگیں۔

بیرے نے بسم اللہ ہوٹل سے پلٹ کر بتایا کہ جان سونے کے لیے لیٹ گیا ہے اور اس طرف نہیں آنا چاہتا۔

گوری یہ سن کر غصے میں کانپتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی بسم اللہ ہوٹل میں گھس گئی۔۔۔۔ تھوڑی دیر تک اندر سے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کی آوازیں آتی رہیں۔۔۔۔۔ دونوں آپس میں الجھ پڑے تھے اور گوری نے پانی کا گلاس جان کے سر پر توڑ دیا تھا۔

مرزا بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کر اسے کلفشاں ہوٹل تک واپس لایا۔۔۔۔۔ وہ سبکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اس نے جان کا سامان الگ کر کے بسم اللہ ہوٹل بھجوا دیا اور کہنے لگی' کوئی بات نہیں اب میں اپنے گھر پہنچ گئی ہوں۔ اس کی ماں کا آبائی گھر' اس کا بھی گھر تھا۔

مرزا سنتا رہا۔

گوری کی اس کے اپنے گھر میں آج پہلی رات تھی۔

اس نے لاہور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ اور دہلی بھی جانا تھا۔ یہ تین شہر دیکھنے کے شوق میں گوری نے ہزاروں میل کا سفر کیا تھا۔ اسے اس لمبے سفر کی صعوبتیں بھول گئی تھیں' آج وہ بہت خوش تھی۔ اسے اگر کسی بات کا دکھ تھا تو وہ یہ کہ اس نے ان لمبی منزلوں کے سفر پر نکلتے وقت اپنا ہمراہی غلط چنا تھا۔ جان کے ساتھ شہرداری کا رشتہ تھا' کالج میں وہ اس کا ساتھی اور کرسچین بھائی تھا' لیکن وہ کوئی اچھا آدمی نہ تھا۔

وہ بڑی حسرت کے ساتھ بولی کہ کاش اس سفر میں مرزے کا ساتھ ہوتا۔

کلفشاں ہوٹل کا مالک' دونوں ہوٹلوں کے بیرے اور مرزا بھیڑیوں کی طرح بغیر پلکیں جھپکے ساری رات جاگتے رہے۔ صبح ہوئی تو جان بغیر اطلاع کیے بس پکڑ کر لاہور کی سمت نکل گیا۔

گوری نے بھی لاہور جانا تھا لیکن وہ جانے سے پہلے اس گاؤں کی سیر کرنا چاہتی تھی۔

ہندوستان پاکستان کے پہاڑی سلسلے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے گڈریوں کے بارے میں اس نے بہت سی کہانیاں اپنی ماں سے سن رکھی تھیں۔

کتنی مقدس خاموشی ہے۔ یہاں کے پہاڑوں پر' ان کی وادیوں میں اور دریا کے چلتے پانی کے دونوں کناروں پر۔۔۔۔ اس نے خیال کیا' اور جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ آج وہ اپنے خوابوں کے دیس میں تھی اور ہر چیز کو بہت قریب سے محسوس کرنے جا رہی تھی۔

گوری نے پانی کی بوتل ساتھ رکھنے کے لیے اپنا سامان کھولنا چاہا تو اسے خیال آیا۔ ان اونچے پہاڑوں کی ہری بھری وادیوں میں نیلے شفاف پانی کے چشمے ہوں گے اور میٹھے پانی کے ذخائر' پھر اس پانی کو ساتھ رکھنے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ وہ اپنی کم عقلی پر ہنس دی۔

سڑک عبور کر کے ڈھلوان پر ڈولتے سنبھلتے ہوئے اس نے مرزے کا بازو تھام لیا۔ وہ بارشوں میں دھلے ہوئے سنگریزوں کو پاؤں سے ٹھوکریں مارتے ہوئے کہہ رہی تھی:

"یورپ میں لوگ دوسروں کے جذبات کا احترام بھول چکے ہیں۔ وہاں گھٹن ہے۔۔۔ مشینی زندگی۔۔۔۔ منشیات کا استعمال اور جانے کیا کیا۔۔۔۔۔"

مرزے نے پھیلی ہوئی باچھوں میں سے ٹپکتی ہوئی رال کو اپنی آستینوں سے پونچھتے ہوئے سوچا۔۔۔ یہ خوبصورت لڑکی ایک غیر مرد کے ساتھ فرانس' جرمنی' آسٹریا' ترکی' ایران اور افغانستان کا پینڈا کھوٹا کرتی یہاں تک آئی ہے۔ ان کا رات دن کا ساتھ تھا اور آج اسے برا کہہ رہی ہے' بے شک عورت کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔

پہاڑ پر چڑھتے ہوئے گوری کا سانس پھول گیا۔۔۔۔ اس اونچائی سے دونوں نے پیچھے مڑ کر ترائی میں دیکھا۔ دھوپ میں چمکتی اور بل کھاتی ہوئی شیر شاہ سوری روڈ دور پہاڑوں میں گم ہو گئی تھی۔ سڑک کے کنارے نسرے ہوئے ہوٹل اور سیاہ پتھروں کے بنے چھوٹے چھوٹے مکان دیکھنے میں بھلے لگ رہے تھے۔ گوری نے مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی طرف نگاہ کی۔ ایسے میں اچانک مرزے نے اسے اپنی مضبوط بانہوں میں بھر لیا۔ پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا' مغلوں کی

نزول اولاد اپنی سنہری موچھوں میں مسکراتی رہی۔ گوری نے گھبرا کر الگ ہونا چاہا' لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔

دیر تک ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔ مرزا شام تک وہیں پڑا سوتا رہا اور گوری گرتی سنبھلتی نیچے ہوٹلوں تک پہنچ ہی گئی۔

میں شاید پہلے بتا چکا ہوں کہ مرزا شام کو سورج ڈوبنے کا نظارہ اس سامنے والے برساتی نالے سے کرتا ہے۔

وہ غروب آفتاب سے کچھ ہی دیر پہلے جب نیند بھری آنکھوں کے ساتھ نیچے آیا تو لاری اڈے پر روئی روئی شکلوں والے بجلی کے کھمبے جاگ اٹھے تھے' اور گوری جا چکی تھی۔

گلفشاں ہوٹل والے کے پاس گوری مرزے کے لیے ایک رقعہ چھوڑ گئی تھی۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا میں آپ کو بھی مختصراً بتاتا چلوں:

"ـــــ میں نے غلط پڑھا اور جھوٹ سنا تھا کہ مشرق اور اس کے باسی مغرب والوں سے مختلف ہیں۔ مرزے' تم میں اور جان میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے لاہور' دہلی اور لکھنؤ نہیں جانا۔ میں یہیں سے پلٹ رہی ہوں ـــــ میں اپنے گھر کے قابل نہیں رہی۔"

لاکر زمین بند آوازیں

رات کا پہلا پہر تھا جب وہ دونوں ہانپتے کانپتے ہوئے اس غیر آباد کنوئیں تک پہنچے تھے۔
ان دونوں نے اہم سرکاری دستاویزات کے بھاری پلندے مضبوطی کے ساتھ تھام رکھے تھے۔ ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کے لیے محض اس لیے اجنبی نہ تھے کہ ہر دو نے اہم دستاویزات سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کی خاطر اس غیر آباد علاقے میں ایک ہی اجاڑ کنوئیں کا انتخاب کیا تھا۔

اس افراتفری کے عالم میں تفصیلات میں جانے کا وقت ہی کہاں تھا' جان کے لالے پڑے تھے۔۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں بیک وقت وہاں پہنچے تھے اور ایک دوسرے سے تعارف کے لیے یہ بہت تھا۔

دونوں نہایت خاموشی سے ایک ایک کر کے کنوئیں کی منڈیر پر جھکے اور اپنے اپنے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔

اب وہ اس کھلے میں' کنوئیں کی نیم پختہ منڈیر پر پھسکڑا مار کر بیٹھ رہے تھے۔ ان دونوں کے تھری پیس سوٹ' کچی مٹی کی بو باس جذب کر رہے تھے اور دونوں میں سے ہر ایک کی گردن پر کسی ہوئی نکٹائی کی گرہ ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

وہ دیر تک یوں ہی ساکت رہے اور پھر ان دونوں میں سے کسی ایک نے اپنے سینے میں

گہرا سانس بھرا اور آپ ہی آپ بڑبڑایا:

"غضب خدا کا' دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔"

"لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔" دوسرے نے قدرے متوحش نگاہوں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے' جواب میں کہا۔

"ہاں کبھی نہیں۔"

چہرے مہرے کی خشونت اور شدید گھبراہٹ کا احساس دونوں میں مشترک تھا۔

"کچھ زمانہ ہی ایسا آگیا کہ اعتبار اٹھ گیا۔ پکے اشنام پر لکھت پڑھت اپنے معنی گم کر بیٹھی۔"

"آپ سچ کہتے ہیں۔ ایسے میں زبانی کہے سنے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ بہت روکا' بہت سمجھایا لیکن نہیں صاحب۔۔۔۔ ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آتا تھا۔ ایسے میں کوئی کیا کرے۔"

"بہت بچ بچا کر یہ ریکارڈ یہاں تک لانے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"شکر ہے خدا کا۔۔۔ کیا خیال ہے اب تک کاغذات کی روشنائی پانی میں ایک نہیں ہو گئی ہو گی؟"

"کب کی۔۔۔ لیکن شک سا پڑتا ہے۔ یہ کنواں کہیں خشک ہی نہ ہو۔"

یہ سن کر دوسرا سناٹے میں آگیا اور بعد تامل کے بولا:

"کیا آپ نے اس سے پہلے دن کی روشنی میں اطمینان نہیں کر لیا تھا؟"

"اتنا وقت کس کے پاس تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں' یہ سب یکایک ہوا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے۔"

اب دونوں کو چپ سی لگ گئی۔ دیر تک گم سم بیٹھے رہے' پھر ایک نے کچھ یوں استفسار کیا:

"آپ کے اس بھاری بوجھ کی آواز نہیں آئی کنوئیں میں گرنے پر۔۔۔۔ سنی تھی آپ

نے؟"

"نہیں، میں نے دھیان نہیں دیا۔ آپ کہیے، جب میں کنوئیں پر جھکا تھا تو آپ نے کسی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز سنی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔۔۔ دراصل ہم بہت جلدی میں تھے۔"

۲

ادھر وہ دونوں سخت تشویش کے عالم میں اجاڑ کنوئیں کی مینڈ پر جھکے ہوئے ہیں اور ادھر گاؤں کے چوپالوں اور گلیاروں، شہر کے گلی محلوں اور دکانوں کے تھڑوں پر گئے وقتوں کے لوگ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں تھامی ہوئی عرضداشتوں کے پلندے لہراتے ہیں۔

بحث مباحثہ طول پکڑ گیا ہے۔ گئے وقتوں اور نئی سرکش نسل کے درمیان افہام و تفہیم کی ساری راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ عقل سخت حیران ہے کہ وہ درمیان کے لوگ کیا ہوئے۔ وہ، جو گئے وقتوں اور نئی نسل کے درمیان میں پل بنا کرتے تھے۔

ہر طرف ایک ہڑبونگ مچا ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ شور ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔ گاؤں کی چوپالوں اور گلیاروں، شہر کے گلی محلوں اور دکانوں کے تھڑوں پر رعشہ زدہ ہاتھ ہیں، جن کا کوئی شمار نہیں۔

مردہ خانوں سے دس دس، بیس بیس سال پرانے پوسٹ مارٹم کیے گئے مردے اپنے دو لخت سروں اور موٹے بخیے سے سلے ہوئے پیٹ کو تھامے ہوئے گرتے پڑتے چلے آتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹوں کے خستہ اوراق کے انبار ابھی کچھ ہی دیر پہلے اجاڑ غیر آباد کنوئیں میں جھونک دیے گئے۔

کوئی کہتا ہے:

"امت وسط کیا ہوئی؟ کہاں گئے وہ لوگ، جو اس نسلی خلیج کو پاٹ دیا کرتے تھے؟؟"

۳

رات کا پچھلا پہر ہے اور اجاڑ کنوئیں کی منڈیر پر جھکے ہوئے دو بوجھل وجود کنوئیں کی سمت مسلسل جھکتے ہی چلے جاتے ہیں۔
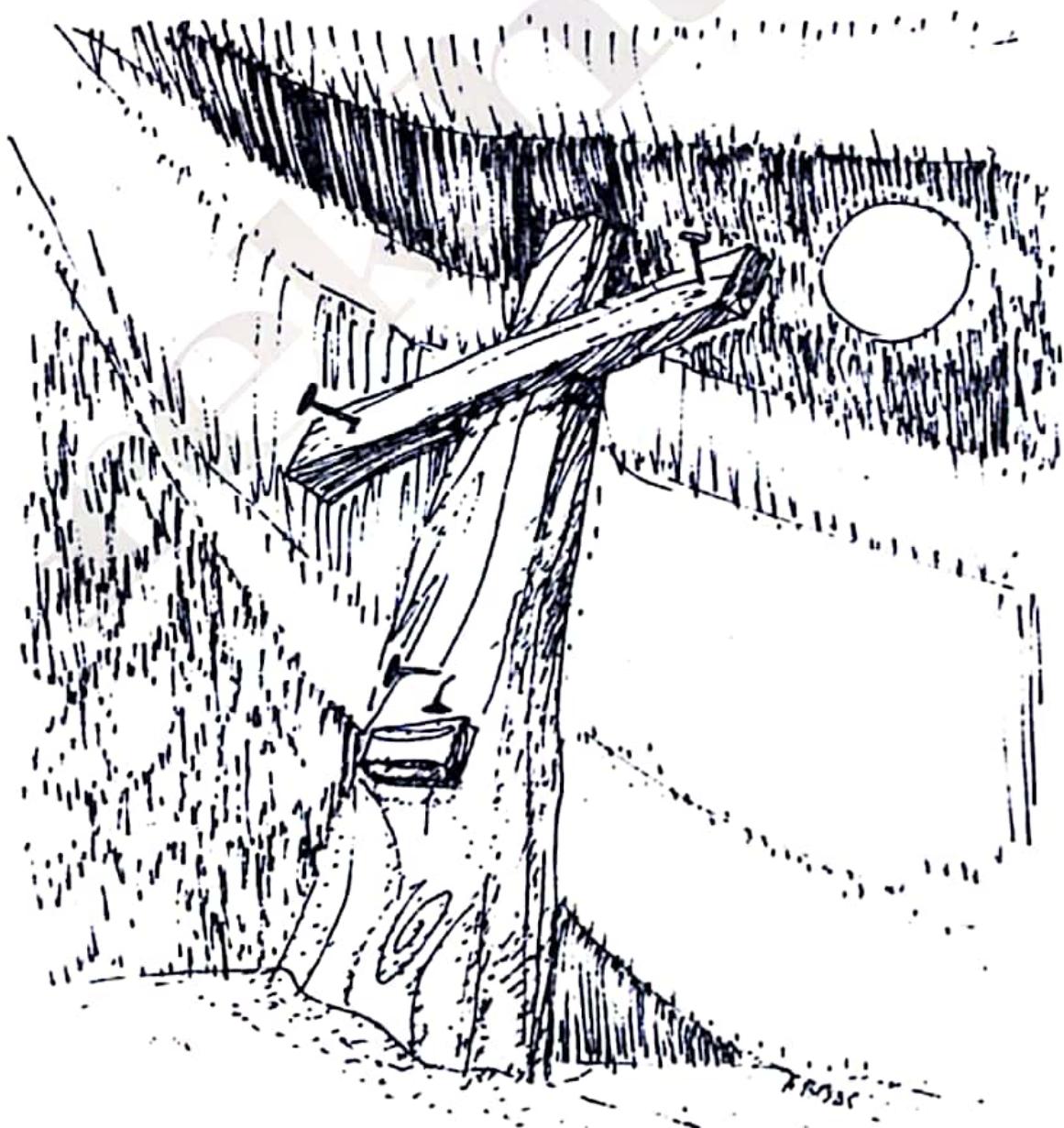
گناہ کی مزدُوری

آسمان کی بادشاہت خمیر کی مانند ہے، جسے ایک عورت نے لے کر تین پیمانے آٹے میں گوندھا اور سارے کا سارا خمیر ہو گیا۔

داستان گو کا کہنا ہے کہ یروشلم سامی النسل پروہتوں کے ہاتھوں میں ایک غیر آباد زمین کی طرح تھا، جس میں آسمانی بادشاہت ایک خزانے کی مانند گڑی تھی، اور جسے ایک بڑھئی کے بیٹے نے اپنے لیے پسند کیا۔ سب نے دیکھا اور سنا کہ اس نے وہاں گلہ بانی کی اور بھیڑیں چرانے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ پس اس کا یہی ایک جرم تھا۔ یہ جرم تھا بھی یا نہیں، اس کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔

فریسی بزرگ اسے ناصریہ سے پکڑ کر یروشلم کھینچ لائے تھے اور اس وقت وہ سر نیوڑھائے رومن حاکم کے سامنے رسیوں میں جکڑا، کھڑا تھا۔

پروہتوں نے حاکم سے مطالبہ کیا کہ اس سے پوچھو، یہ اپنی صفائی میں کیا کہتا ہے۔

تب حاکم نے پوچھا: "کیا تو اپنے تئیں اس سرزمین کا بادشاہ خیال کرتا ہے؟"

جواب میں اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور بولا: "بے شک، لیکن میری بادشاہت اس جہان کی نہیں۔ اگر اس جہان کی ہوتی تو میرے چاکر تیرے سپاہیوں سے لڑتے اور تم مجھے اس حال میں نہ پاتے۔"

سننے والوں نے یہ سنا اور جی بھر کر ٹھٹھا کیا' لیکن حاکم تھا کہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ روز' روزِ فسح تھا اور حاکم کا دستور تھا کہ ہر عید پر ایک قیدی' جسے رعایا چاہتی' رہا کر دیتا۔

حاکم نے ٹھٹھا کرنے والوں پر نگاہ کی اور حاکم کے سپاہی ایک مکروہ صورت شخص کو رسیوں میں جکڑے ہوئے دربار میں کھینچ لائے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ٹھٹھا کرنے والے لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور انہوں نے عباؤں سے اپنے چہرے ڈھانپ لیے' مبادا پہچان لیے جائیں۔

حاکم نے دربار میں نگاہ کی اور بولا: "کہو! ان دونوں میں سے کس کے حق میں فیصلہ کرتے ہو؟ ایک طرف ناصریہ کا یہ پردیسی' ہڈیوں کا پنجر ہے اور دوسری طرف زوروں میں زور برابا ڈاکو۔ ایک کو دیکھ کر تم ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے اور دوسرے کو دیکھ کر اپنے چہرے ڈھانپ لیتے ہو۔ آج روزِ فسح ہے اور تمہاری منشا کے مطابق میں نے ایک قیدی کو رہا کرنا ہے۔ کہو ان دونوں میں سے کسے رہا کیا جائے؟"

یہ سن کر سردار کاہن اور فریسی بزرگ نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی اپنی جماعت کو ابھارا کہ برابا ڈاکو ہمیں قبول ہے اور چلا چلا کر کہا کہ دوسرے کو سولی چڑھاؤ۔ اس چیخ و پکار کرنے والی منڈلی میں ایک وہ بھی تھا جس نے محض تیس اشرفیوں کے عوض اس پردیسی کے خلاف جھوٹی گواہی دی تھی' سو اس نے واویلا کیا اور وہ رقم واپس کرنا چاہی لیکن اس وقت اس کی کون سنتا۔ سردار کاہن اور فریسی بزرگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ "سولی دو۔۔۔ سولی"۔

تب اس جھوٹے گواہ نے مجبور ہو کر اشرفیاں وہیں پھینکیں اور سخت پشیمانی کے عالم میں وہاں سے چلا۔ اب اس کے سامنے کوئی اور راستہ نہ تھا' سو اس نے گھر جا کر خود کو پھانسی دی۔

سردار کاہنوں اور فریسی بزرگوں نے اس ٹھکرائی ہوئی رقم کو ہیکل کے خزانے میں جمع کرنے کی بجائے باہم مشورہ کر کے ایک کمہار کا کھیت پردیسیوں کو دفن کرنے کے لیے خریدا۔

اور ایک پردیسی حاکم کے سامنے رسیوں میں جکڑا کھڑا تھا۔

یہ دیکھ کر حاکم مکرے نادیر اپنا سر نیوڑھائے بیٹھا رہا۔ رعایا براباڈاکو کی رہائی کا مطالبہ کر رہی تھی اور ہلڑ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ حاکم نے متعجب ہو کر پوچھا کہ تم جسے صلیب پر دیکھنا چاہتے ہو' اس پر کیا فرد جرم عائد کرتے ہو؟

یہ سن کر سردار کاہن اٹھ کھڑا ہوا اور عالم طیش میں بازو لہرا لہرا کر پہلے تو اس ہڈیوں کی مٹھی کو برا بھلا کہا اور پھر بولا: "عالی جاہ! یہ کہتا ہے کہ آسمان کی بادشاہت اس شخص کی مانند ہے جس نے اچھا بیج اپنے کھیت میں بویا اور جب وہ سو گیا تو اس کا دشمن کڑوے بیج اس کے کھیت میں بکھیر گیا۔ جب سبزہ ظاہر ہوا اور بالیاں لگیں تو میٹھے دانوں کے ساتھ کڑوے دانے بھی ظاہر ہوئے لیکن وہ نچنت رہا اور دونوں کو بڑھنے اور پھولنے پھلنے دیا۔ جب فصل سمیٹنے کا موسم آیا تو میٹھے خوشے الگ کر لیے گئے اور کڑوے خوشوں کے گٹھڑ الگ باندھے گئے تاکہ جلانے کے کام آئیں۔

کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنہیں یہ بدکار خیال کرتا ہے وہ اخیر جلتے تنور میں جھونک دیے جائیں گے؟ راست باز اور شریر کا فیصلہ کرنے والا یہ کون ہوتا ہے؟؟"

سردار کاہن ابھی بیٹھنے نہ پایا تھا کہ ایک سفید ریش فریسی بزرگ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: "حضور! یہ کہتا ہے کہ آسمان کی بادشاہت گھر کے مالک کی مانند ہے جو تڑکے باہر نکلا تاکہ تاکستان میں مزدوروں کو مزدوری پر لگائے اور اس نے ایک ایک دینار مزدوری مقرر کر کے انہیں اپنے تاکستان میں بھیجا۔ پہر دن چڑھے مزید مزدور بھرتی کیے اور تیسرے پہر کو بھی ایسا ہی کیا۔ جب شام ہوئی تو اس نے اپنے منشی سے کہا کہ مزدوروں کو بلا اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک ان کی برابر مزدوری دے۔ تب وہ جنہوں نے گھنٹہ بھر کام کیا تھا آئے اور ایک ایک دینار پایا۔ جب اگلے آئے تو انہیں یہ گمان تھا کہ ہم زیادہ پائیں گے مگر انہوں نے بھی ایک ایک دینار ہی پایا۔ تب وہ تاکستان کے مالک پر کڑکڑائے اور کہا پچھلوں نے ایک گھنٹہ کام کیا اور تو نے

انہیں ہمارے برابر کر دیا حال آنکہ ہم نے سارا دن محنت کی اور دھوپ سہی۔ اس نے ان میں سے ایک کو جواب دیا کہ اے میاں! میں تجھ پر ظلم نہیں کرتا۔ کیا تو نے خود ایک دینار پر مجھ سے قبول نہیں کیا؟ اپنا حصہ لے اور چلا جا۔ کیا روا نہیں کہ اپنے مال سے جو چاہوں سو کروں؟

عالی جاہ! یہ اس ناکستان کے مالک کا ہمنوا ہے اور ہماری روایات کا باغی' سو ہمارا مطالبہ ہے کہ اسے سولی دے۔"

حاکم نے یہ سب سنا اور ہاتھ دھونے کو پانی کا تسلا طلب کیا۔ لوگ چلا چلا کر برابا ڈاکو کی رہائی اور اس ہڈیوں کی مٹھی کو سولی چڑھانے کا مطالبہ کر رہے تھے اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

حاکم نے ان لوگوں کے روبرو اپنے دونوں ہاتھ تسلے کے پاک پانی میں دھوئے اور کہا: لو' اب میں اس راستباز کے خون سے پاک ہوا..... تم جانو اور تمہارا ایمان' میں اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

پروہت یک زبان ہو کر بولے: "اس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد پر۔"

تب برابا ڈاکو رہا کر دیا گیا اور اس ہڈیوں کی مٹھی پر کوڑے برسائے گئے۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہجوم خوشی سے پھولے نہ سمایا اور کوڑوں کی سنسناہٹ کے ساتھ اٹھتی ہوئی سسکی پر نعرہ ہائے داد و تحسین بلند ہوا۔ حاکم کے سپاہی اسے کھینچ کر پرتورین میں لے گئے اور ارغوانی پوشاک پہنائی پھر اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھتے ہوئے جھک جھک کر کہا: "سلام----- سلام" اور ہر سلام کے ساتھ اسے کس کر طمانچے مارے اور حقارت سے تھوکا۔

حاکم اس ارغوانی پوشاک میں ملبوس ہڈیوں کی مٹھی کے ساتھ پرتورین سے بپھرے ہوئے ہجوم تک چل کر آیا اور بولا: "دیکھو' میں اسے تمہارے پاس لے آیا ہوں تاکہ تم جانو کہ میں اس کا کوئی قصور نہیں پاتا۔ اسے پرکھو اور خود فیصلہ کرو۔"

اس پر سردار کاہنوں نے چلا چلا کر کہا: "ہم شریعت والے ہیں اور یہ باغی واجب

القتل۔۔۔۔۔ اسے صلیب دے۔"

یہ سن کر حاکم کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس کانٹوں کے تاج والے کو اپنے ساتھ لے دیوان خانے میں چلا گیا' جہاں اور کوئی نہ تھا۔ حاکم نے دھیرج سے پوچھا: "بول! بولتا کیوں نہیں۔ تو کہاں کا ہے؟"

وہ چپ رہا۔

حاکم نے چڑ کر کہا: "کیا تو مجھ سے بات نہیں کرے گا؟ بول کہ مجھے تجھ کو آزاد کر دینے کا مکمل اختیار ہے اور اگر چاہوں تو تجھے سولی چڑھادوں۔"

تب ارغوانی چولے اور کانٹوں کے تاج میں جنبش ہوئی: "ہاں اگر یہ تجھے اوپر سے نہ دیا جاتا تو تیرا مجھ پر کچھ اختیار نہ ہوتا۔ جس نے مجھے تیرے حوالے کیا' اس کا گناہ بڑا ہے۔"

یہ سن کر حاکم متذبذب ہوا' لیکن سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اسے مزید مکر کرنے کی مہلت نہ دی اور یوں سب نے دیکھا کہ اس ارغوانی چولا پہنے' سر پر کانٹوں کا تاج رکھے' دہنے ہاتھ میں زوفے کی شاخ تھامے اور ذرا سا جھک کر چلتے ہوئے شخص کے کندھے پر اسکی اپنی صلیب دھری تھی اور وہ گلگتا کی جانب رواں تھا۔ ایسے میں اس کی خاطر چھاتی پیٹتی اور روتی ہوئی عورتوں کی ایک ٹولی اس کے پیچھے چلی۔ جن میں سب سے نمایاں وہ دو تھیں اور دونوں کا نام مریم تھا۔ ایک تو اس کی ماں اور دوسری' جو اس کی سگی تھی۔

وہ بھاری صلیب اٹھائے گلگتا کی جانب رواں تھا اور یہ جانتا تھا کہ اب تک ادھر سے کوئی نہیں پلٹا۔ اس نے نسوانی ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز سنی تو گردن موڑ کر دیکھا۔ رکا نہیں اور اس نے صرف اتنا کہا: "مجھ پر مت روؤ۔۔۔۔۔ روؤ اپنے بیٹوں کے مقدر پر' جو ہرے بھرے درخت کو یوں کاٹے ڈالتے ہیں۔۔۔۔۔ کل تم دیکھو گی کہ سوکھے ٹھنڈ بھی چیرے جائیں گے۔"

سامنے اونچا تھڑا تھا' جہاں پہنچ کر وہ رک گیا۔ مصلوب ہونے سے پہلے اس نے پت ملا سرکہ پینے سے انکار کیا۔ وہ اپنی موت کے تمام مراحل کو محسوس کرنا اور ہوش میں رہنا چاہتا تھا۔

حاکم کے کارندوں نے اسے صلیب پر لیٹ جانے کو کہا اور وہ لیٹ گیا۔ اب سوکھے ٹھنڈ تیزی سے حرکت میں آئے اور اس ارغوانی چولے میں لپٹے ہوئے وجود کو کیلوں کے ساتھ چھید ڈالا۔ صلیب اٹھا کر زمین میں گاڑنے سے قبل انہوں نے ارغوانی چولے کو کھینچ کر اتارا اور اسے برہنہ کر دیا۔ سب نے دیکھا کہ اس کے دائیں اور بائیں اطراف میں دو چور بھی صلیبوں پر لٹکتے ہیں۔

اس وقت سورج ان تینوں کے سر پر چمک رہا تھا۔ وہ صلیب پر ننگا تھا اور اس کے خون نچڑتے پیروں کے قریب کھڑی' وہ دو تھیں' جو اپنی بھاری چادروں سے چہرے ڈھانپے روتی تھیں۔

تیسرے پہر شفق پرشام کی زردی کھنڈتی چلی گئی اور اس روز شام کے دھندلکے نے خلاف معمول بہت جلد اس سرزمین کو ڈھانپ لیا۔ انتہا کے کرب میں اندھیرے سے گھبرا کر ایک چور نے اپنی نحیف آواز میں کہا: "اے پردیسی! اگر تو سچا ہے تو اس صلیب سے اتر۔۔۔۔ خود کو اور ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا۔"

یہ سن کر دوسرے چور نے اپنے بھائی بند کو ملامت کرتے ہوئے کہا: "ناروا نہ بک۔۔۔۔ ڈر اس خدا سے کہ جس نے ہم تینوں کو اس مقام تک پہنچایا۔ ہم دونوں تو واجبی گرفتار ہیں اور اپنے کیے کا پھل پاتے ہیں' مگر اس کا تو کوئی قصور نہیں' پھر ہمارے ساتھ کیوں سزا بھگت رہا ہے؟"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ کراہتی ہوئی عورتیں وہاں سے ہٹ گئیں اور حاکم کی طرف سے مامور کردہ کارندے اس بن سلے ارغوانی چولے کی بابت کچھ فیصلہ نہیں کر پائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ چاروں اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسے پھاڑ کر چار ٹکڑے کرنے کی بجائے قرعہ ڈال لیں کہ وہ ثابت و سالم کسی ایک کے کام تو آئے' لیکن عین اس وقت صلیب پر ننگی ہڈیوں کی مٹھی میں جنبش ہوئی: "ایلی۔۔۔۔ ایلی۔۔۔۔ لما شبقتنی؟ اے رب۔۔۔۔ اے میرے رب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟"

قریب ہی پت اور سرکے سے بھرا لوٹا رکھا تھا۔ حاکم کے کارندوں نے قرعہ اندازی چھوڑ کر ادھر توجہ کی اور اسفنج کو سرکے میں بھگوتے ہوئے زوفے کی شاخ پر رکھ کر اس کے ہونٹوں تک اوپر اٹھایا۔ جب اس نے سرکہ چکھا تو کہا: "تمام ہوا"۔ اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

چاروں کھونٹ نیم تاریک تھے۔

یروشلم کے باسیوں کو یہ منظور نہ تھا کہ بدشگونی ہو اور لاشیں سبت کے دن صلیبوں پر رہ جائیں۔ سو، حاکم کے پیادے سرشام وہاں پہنچے اور مصلوب شدہ چوروں کی ٹانگیں توڑنے میں جت گئے تاکہ جلد مرجائیں اور انہیں تہوار کے آغاز سے قبل صلیبوں پر سے اتار لیا جائے۔ سپاہیوں میں سے ایک نے ناصریہ کے پردیسی کی جانب نگاہ کی تو جانا کہ تمام ہوا۔ تب اس نے احتیاطاً اپنے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور تینوں لاشیں اتار لی گئیں۔

اس دھندلکے میں ارمتیہ کے یوسف نے ڈرتے ڈرتے حاکم سے ملاقات کی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے منزلیں مارتا ہوا یروشلم پہنچا تھا۔ یہاں آ کر معلوم کیا تو جانا کہ وہ مصلوب ہوا۔ یوسف اس پردیسی کے ننھیال سے آیا تھا اور سخت شکستہ خاطر تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پھر اس نے انتہائی رازداری سے اسے دفنانے کی اجازت چاہی۔

حاکم نے صوبے دار کو بلا کر پوچھا کہ کیا وہ مرگیا؟ اور جواب میں صوبے دار نے اثبات میں گردن ہلائی۔

عید کا ہنگامہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور یوسف کو بہت جلدی تھی۔ وہ رات سے پہلے کفن دفن کا بندوبست کر دینا چاہتا تھا۔ سو، حاکم کی اجازت سے بازار کے بھیڑ بھڑکے میں سے ہوتا، وہ گلگتا تک پہنچا۔ اس نے کفن کے لیے مہین دوشالہ ابھی ابھی بازار سے خریدا تھا اور اس وقت وہ اسے اپنی بغل میں دابے تینوں صلیبوں کے بیچ، حیران کھڑا تھا۔ یوسف جانے کتنی دیر اس ملگجے اندھیرے میں ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ آبادی کا شور گھٹنا شروع ہوا اور مشعلیں ایک ایک کر کے بجھنے لگیں۔ پھر وہ جھکا اور تادیر جھکا رہا۔ اس ہڈیوں کی مٹھی کی پیشانی پر طویل بوسہ دے کر

اس نے برہنہ جسم کو احتیاط کے ساتھ سوتی دوشالے میں لپیٹا اور اس کے سرانے چپ چاپ بیٹھا رہا، تاوقتیکہ اس کا دوسرا ساتھی مر اور عود لے آیا اور یوں وہ دونوں میت کو خوشبوؤں میں بسا کر قریبی باغ میں اٹھالے گئے، جہاں ایک تازہ کھدی ہوئی قبر پہلے سے موجود تھی۔

داستان گو کہتا ہے کہ قبریں مردے سے طلب کرتی ہیں اور وہ کفن میں زندگی لپیٹ لائے تھے۔ دونوں گہری سوچ میں غرق تادیر بیٹھے رہے، یہاں تک کہ صبح کے آثار جاگے۔ یوں انہوں نے جلدی جلدی اسے امانتاً" قبر میں لٹایا اور مٹی دینے کی بجائے ایک بھاری پتھر سے قبر کو ڈھانپ کر روپوش ہو گئے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ وہیں کہیں چار اشکبار آنکھیں تھیں، جو یہ سب کچھ دیکھتی تھیں۔ وہ دو تھیں اور دونوں نام مریم تھا۔

وہ قیامت کی رات تھی۔ اس رات ہیکل کا پردہ اوپر سے نیچے تک چاک ہوا، زمین لرزی، پتھر تڑخ گئے اور زمین میں صدیوں کے گڑے ہوئے پاک لوگ، جو بہت آرام میں تھے جی اٹھے اور خدا کی دھرتی پر تمام رات نیند میں ڈوبی ہوئی آبادیوں کی سنسان گلیوں میں گھوما کیے۔

اگلے روز عید فسح کا بڑا دن تھا۔

سردار کاہن اور فریسی بزرگ ایک بار پھر یکجا ہوئے اور حاکم سے یک زبان ہو کر کہا:

"وہ دغاباز جیتے جی کہا کرتا تھا کہ میں تمہارے جتن سے مرنے کا نہیں، تیسرے روز جی اٹھوں گا۔ اس لیے مسلح کارندوں کو حکم دے کہ تین دن اور تین راتیں مسلسل قبر کی نگرانی کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی مردود اس کی لاش کو چرا لے جائے اور لوگوں کو یقین آئے کہ وہ واقعتاً" جی اٹھا ہے۔"

حاکم نے اس بات سے اتفاق کیا اور پتھر پر مہر لگا کر پہرے داروں نے قبر کو گھیرے میں لے لیا۔

اس رات کو بھی گزرنا تھا سو گزر گئی۔

داستان گو کا بیان ہے کہ کوئی بدشگونی نہیں ہوئی۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ عید کے روز

سارا دن اور تمام رات گلیوں اور بازاروں میں چہل پہل رہی' ہنسی ٹھٹا ہوا' انواع و اقسام کے مشروبات اور مرغن غذائیں نوش جاں کی گئیں۔ مسلح کارندے نگرانی پر مامور رہے لیکن پردیسی کا کہا سچ ثابت ہوا۔

اگلے روز سب نے دیکھا کہ بھاری پہرے اور مہر کرنے کے باوجود قبر کا پتھر اپنی جگہ پر نہ تھا۔ قبر کے اندر دوشالہ کے ٹکڑے پڑے تھے اور وہ رومال جو پردیسی کے سر پر بندھا تھا' ان کپڑوں کے ساتھ نہ تھا بلکہ لپیٹ کر الگ رکھ دیا گیا تھا۔

اس ہڈیوں کی مٹھی کے یوں جی اٹھنے کا اعتبار کسی نے نہ کیا' سوائے ان چار اشکبار آنکھوں کے' جو ظاہر اور باطن پر یکساں گڑی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے مارنے سے اس نے مر کر نہیں دیا۔

سردار کاہنوں نے فریسی فقیہوں کے ساتھ مل بیٹھ کر فیصلہ کیا اور بموجب فیصلے کے' حاکم کے کارندوں نے برملا کہا کہ اس رات ہمیں اونگھ آ گئی اور اس کے شاگرد اسے چرا لے گئے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس کے یوں جی اٹھنے کا اعتبار اس وقت تک نہ کریں گے' جب تک کہ خود اپنی آنکھوں سے اس کے ہاتھوں میں میخوں کے بنائے ہوئے سوراخ نہ دیکھ لیں اور ان سوراخوں میں اپنی انگلی نہ پھیر لیں۔

داستان گو کہتا ہے کہ پردیسی نے یہ سب دیکھا اور سنا' تب دریائے طبریاس کے کنارے وہ اپنے چاہنے والوں پر ظاہر ہوا۔ وہ برہنہ تھا اور اپنے ارغوانی چولے سے بے نیاز۔

شمعون نے آگے بڑھ کر اپنی تہمد سے اس کی ننگی کمر کو باندھا۔ اس وقت اس کے سارے چاہنے والے حیران اور ہمہ تن متوجہ تھے۔

ناصریہ کا پردیسی گویا ہوا اور اس نے شمعون سے دریافت کیا: "اے یونس کے بیٹے شمعون! کیا یہ تیرا دعویٰ نہیں کہ تو مجھے سب سے بڑھ کر چاہتا ہے؟"

شمعون نے جھک کر کہا: "بے شک' حقیقت آپ پر عیاں ہے۔"

اس پر اس ہڈیوں کی مٹھی نے کہا: "میرے برے چرا۔"

شمعون کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموش رہا تو آواز آئی: "اے شمعون! کیا تو مجھ سے پیار کرتا ہے؟"

شمعون بولا: "بے شک' حقیقت آپ سے کب چھپی ہے؟"

اس پر اس ہڈیوں کی مٹھی نے کہا: "میری بھیڑیں چرا۔"

شمعون جواب میں کیا کہتا؟ بس خاموش رہا اور یہی سوال تیسری بار پوچھا گیا۔

شمعون نے سخت دلگیر ہو کر وہی جواب دوہرایا۔

اس پر ہڈیوں کی مٹھی نے تیسری بار کہا: "میری بھیڑیں چرا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب تک تو جوان ہے تو اپنی کمر آپ باندھتا ہے اور جہاں کہیں چاہتا ہے' چلا جاتا ہے مگر جب تو بوڑھا ہو گا تو مدد کے لیے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے گا اور دوسرا تیری کمر باندھے گا اور جہاں تو نہ جانا چاہے گا وہاں کوئی دوسرا تجھے کھینچ لے جائے گا۔"

یوں یونس کے بیٹے شمعون پر حقیقت واضح ہو گئی کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ناصریہ کے اس پردیسی کی ننگی کمر کو باندھا تھا۔

داستان گو کہتا ہے کہ وقت ڈھلتی چھاؤں ہے۔ سب نے دیکھا کہ یروشلم زمانے کے لیے مقام عبرت بن گیا۔ یونس کا بیٹا حسب الحکم بھیڑیں چراتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ ناصرت کے مصلوب ہونے والے افراد کی فہرست میں اس پردیسی کا نام کیوں نہیں ملتا؟ اور یہ کہ اس روز دریائے طبریاس کے کنارے پردیسی کی کمر کیوں ننگی تھی؟؟

داستان گو یہ بتانے سے معذور ہے کہ سبت کی رات حاکم کے کارندوں میں سے کس نے قرعہ جیت کر ارغوانی چولا حاصل کیا' اور اس مہین دوشالے کے ٹکڑے کیا ہوئے جو قبر کے کھل جانے پر وہاں سے برآمد ہوئے تھے۔

اس گناہ کی مزدوری کو پشت ہا پشت سے سینت سینت کر رکھنے والوں میں سے کس کا

حوصلہ ہے اور وہ کیوں کر دعویٰ کرے کہ اس چرواہے کی کمر کو اس کے پرکھوں نے ننگا کیا؟

مرزا حامد بیگ کی کتابیں

افسانے

۱ گمشدہ کلمات ۱۹۸۱ء
۲ تار پر چلنے والی ۱۹۸۳ء
۳ قصہ کہانی ۱۹۸۳ء
۴ گناہ کی مزدوری ۱۹۹۱ء

تنقید

۵ افسانے کا منظر نامہ ۱۹۸۱ء
۶ تیسری دنیا کا افسانہ ۱۹۸۲ء
۷ اردو اور مشرقی ازم ۱۹۸۵ء
۸ اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ ۱۹۸۷ء
۹ مقالات ۱۹۹۱ء

تحقیق

۱۰ کتابیات تراجم، علمی کتب ۱۹۸۹ء
۱۱ عزیز احمد، کتابیات ۱۹۸۹
۱۲ ترجمے کا فن، نظری مباحث ۱۹۸۷ء
۱۳ کتابیات تراجم، نثری ادب ۱۹۸۷ء
۱۴ اطالیہ میں اردو ۱۹۸۸ء
۱۵ مغرب سے نثری تراجم ۱۹۸۸ء
۱۶ اردو افسانے کی روایت ۱۹۹۱ء